عدد ۱ ستمبر ۱۹۷۶ء جلد ۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابو الاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

مطبوعات اِدارۂ ترجمان القرآن

★

تفسیر پارہ اوّل	ہدیہ	۶/۵۰ روپے
〃 سورہ الفاتحہ و سورہ البقرہ	〃	۹/- 〃
〃 〃 لقمان	〃	۲/- 〃
〃 〃 یٰسٓ	〃	۲/۲۵ 〃
〃 〃 الفتح	〃	۲/۲۵ 〃
〃 〃 الحجرات	〃	۲/۵۰ 〃
〃 〃 الرحمٰن	〃	۲/۲۵ 〃

★

خطبات حصہ اوّل (حقیقت اسلام)	قیمت	۴/- روپے
〃 〃 دوم (حقیقت صوم و صلوٰۃ)	〃	۲/۵۰ 〃
〃 〃 سوم (حقیقت زکوٰۃ)	〃	۲/- 〃
〃 〃 چہارم (حقیقت حج)	〃	۱/۷۵ 〃
〃 〃 پنجم (حقیقت جہاد)	〃	۱/۲۵ 〃
الجہاد فی الاسلام	〃	۲۳/- 〃
دینیات	〃	۶/- 〃
حقوق الزوجین	〃	۸/- 〃
خلافت و ملوکیت	〃	۱۸/- 〃
سیرت کا پیغام	〃	/۷۵ 〃
اسلام میں انسانی حقوق	〃	۱/۲۵ 〃

★

ادارہ ترجمان القرآن - ۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء مطابق رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۶ھ	جلد ۸۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر: — ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"حقوق نسواں کمیٹی برائے پاکستان" کی رپورٹ پر بحث و نظر کے دوران گذشتہ ماہ کے اشارات میں یہ بات اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ رپورٹ کی دفعہ ۳۵ میں جو سفارش تجویز کی گئی ہے اس میں بیوی کو یہ حق بخشا جا رہا ہے کہ وہ جب چاہے اپنے شوہر کو طلاق دینے کا فیصلہ کرے۔ اس کے بعد جب وہ یونین کونسل کے چیئرمین یا عائلی عدالت کے صدر کو نوٹس دے گی تو محض اس غرض سے دے گی کہ صدرِ عدالت اُس معاوضے کی مقدار کا تعین کرے جو بیوی شوہر کو ادا کرے گی اور ہو سکتا ہے کہ عدالت یہی فیصلہ دے کہ بیوی ایک پیسہ بھی ادا نہ کرے۔ اس کے بعد جس مصالحتی کارروائی کا ذکر اس سفارش میں کیا گیا ہے اس کے متعلق بھی ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ وہ ایک غیر ضروری تکلف و نمائش ہے۔ کیونکہ اس میں عدالت کے ہاتھ ایسے باندھ دیے گئے ہیں کہ عورت کی طرف سے جو پیش قدمی کی جا رہی ہو، خواہ اُسے خلع یا تفریقِ نکاح کا مطالبہ کہا جائے، اس میں عدالت اس مسئلے پر تو غور ہی نہیں کر سکے گی کہ عورت کا یہ اقدام کوئی شرعی و قانونی جواز اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں، بلکہ عدالت کا کام بس ازالہ نکاح کے لیے راستہ صاف اور ہموار کرنا ہوگا۔ مصالحتی کارروائی یہاں بالکل بے معنی اور شرعاً ناجائز ہے۔ تمام علمائے اُمت اور فقہائے سلف نے اسی رائے کو اختیار فرمایا ہے کہ خلع و تفریق میں نکاح کے زائل کرنے کا مطالبہ چونکہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے اس لیے عورت کے خلع قبول کر لینے یا عدالتی فیصلے کے قطعی ہو جانے کے بعد رجعت و مصالحت کا امکان باقی نہیں رہتا اور طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رپورٹ دفعہ ۳۵ کی رو سے فیملی لاز آرڈی ننس کی دفعہ ۸ میں جو ترمیم وضع کی جا رہی ہے اور اس میں جس عدالتی کارروائی کی گنجائش رکھی جا رہی ہے اس کا مقصد و مصرف فقط یہ ہے کہ عورت فسخِ نکاح کا جو پروانہ نوٹس کی شکل میں عدالت کے نام ارسال کر دے، عدالت اسے یک طرفہ ڈگری شمار کر کے اس کی تعمیل کا فریضہ انجام دے۔

مزید دلچسپ اور عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اس تجویز میں بیوی کو اس امر کا بھی مکلف نہیں کیا گیا کہ اس کے دل میں جب "اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی طلب" پیدا ہو تو وہ اس کا اظہار اپنے شوہر سے بھی کرے یا جو نوٹس چیئرمین کو روانہ کیا جائے گا اس کی نقل ہی شوہر کو مہیا کرنے کی زحمت گوارا کرے۔ بیوی کا خطاب براہ راست عدالت سے ہوگا کہ وہ بس اس معاوضہ کا تعین کر دے جو شوہر کو ادا کیا جائے گا۔ اس کے بعد جب عدالت کارروائی کرے گی تو شوہر کو پتہ چلے گا کہ بیوی کے نوٹس پر قانون حرکت میں آچکا ہے اور مصالحتی کارروائی کے ناکام ہونے کی صورت میں نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن یا وضع حمل کے بعد (جو واقعہ بھی بعد میں رونما ہو اس کے اختتام پر) نکاح فسخ ہو جائے گا۔ عورت کے نوٹس کے نوّے دن بعد یا وضع حمل پر نکاح کالعدم ہونے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ کمیٹی اس نوٹس کو عورت کی طرف سے طلاق کا قائم مقام بلکہ طلاق سے بھی بڑھ کر سریع الاثر قرار دے رہی ہے کیونکہ غیر حاملہ مطلقہ کی عدت بھی تین ایام ماہواری کے اختتام تک باقی رہتی ہے جس کی مدت بعض اوقات نوّے دن سے زائد ہوتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس فسخ نکاح کے بعد صرف ایک مرتبہ اپیل کا حق دیا گیا ہے، چنانچہ دفعہ ۳۵ کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"کمیٹی مزید سفارش کرتی ہے کہ خلع کے لیے معاوضہ متعین کرنے کے معاملے میں ایک اپیل کا حق ہونا چاہیے۔"

اس فقرے کی خط کشیدہ عبارت یہ صاف ظاہر کر رہی ہے کہ دفعہ ۳۵ کے تحت عدالت کا اصل کام یہ دیکھنا نہ ہوگا کہ عورت خلع کا مطالبہ کرنے (یا یوں کہیے کہ فیصلہ کرنے) میں حق بجانب ہے یا نہیں، بلکہ عدالت فسخ نکاح کی تو رسمی توثیق لازماً کر دے گی، البتہ اس کے بعد وہ محض یہ طے کرے گی کہ خاوند کو کچھ معاوضہ دلایا جائے یا نہیں اور دلایا جائے تو اس کی مقدار کیا ہو۔ اپیل اگر ہوگی تو اسی تعیینِ مقدار کے خلاف ہوگی۔ تنسیخ نکاح یا خلع کے جائز و مناسب ہونے، نہ ہونے کا مسئلہ نہ نچلی عدالت میں تنقیح طلب ہوگا، نہ بالائی عدالتِ مرافعہ میں۔

دفعہ ۳۵ پر ضروری حد تک بحث کے بعد اب ہم اُن دفعات کا جائزہ لیں گے جن میں کمیٹی نے اپنے خیال

کے مطابق خواتین کے مالی حقوق و مفادات کے تحفّظ کی کوشش کی ہے۔ اس کی عملی صورت دفعہ ۳۹ میں پیش کی گئی ہے جو درج ذیل ہے[1]:

"کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر قانون میں اس مضمون کا کوئی حکم وضع کر دیا جائے تو اس سے اُن عورتوں کی حالت بہتر بنانے میں بہت مدد ملے گی جو طلاق کے بعد مفلس و بے نوا ہو جاتی ہیں۔ اس پر غور کیا گیا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر کی زوجہ کو مہر ادا کرنے اور جہیز واپس کرنے کی دیوانی ذمہ داری کے علاوہ شوہر کو فوجداری مقدمہ قائم کیے جانے کا مستوجب بھی ٹھہرایا جائے اگر وہ مہر کی ادائیگی یا جہیز کی واپسی سے قاصر رہے۔ لہٰذا کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ:

طلاق مؤثر ہونے پر اگر شوہر ایک ماہ کے اندر مہر ادا نہ کرے اور/یا اس کا جہیز واپس نہ کرے تو اسے تین ماہ کی مدت تک کے لیے قید محض یا جرمانہ دونوں سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جائے۔"

اس دفعہ پر اظہارِ خیال سے قبل ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ شرعاً یہ امر سخت ناپسندیدہ اور قابلِ اعتراض ہے کہ عورت کے مہر کی ادائی میں لیت و لعل سے کام لیا جائے اور اُسے طلاق یا وفات تک مؤخر کر دیا جائے۔ اسی طرح بلا کسی معقول عذرِ شرعی کے طلاق کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و مباح امور میں اللہ کے ہاں سب سے زیادہ مبغوض و مذموم قرار دیا ہے۔ لیکن اس صورتِ حال کی روک تھام کے لیے جو تدبیر کمیٹی نے سوچی ہے وہ بھی اپنے اندر بعض قباحتیں اور پیچیدگیاں رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور عائلی زندگی میں بے شمار غیر اسلامی رسوم و رواجات نے جڑ پکڑ لی ہے۔ جب تک ان سب کو نگاہ میں رکھ کر کوئی انسدادی اقدام نہ اختیار کیا جائے کسی ایک قانون سے اصلاحِ حال ممکن نہیں ہے۔ مثلاً اسی مہر ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ اس میں افراط و تفریط کا یہ عالم ہے کہ بعض لوگ تیس بتیس روپے کو شرعی مہر سمجھ کر بس اتنا ہی مہر مقرر کرتے ہیں۔ بعض زوجین

---

[1] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اب تک کی بحث میں ہم نے انگریزی میں شائع شدہ رپورٹ پر انحصار کیا ہے۔ اب ہمیں حکومتِ پاکستان، وزارتِ قانون و پارلیمانی امور کی شائع کردہ ایک اردو رپورٹ بھی دستیاب ہوئی ہے جس کی زبان انتہائی ناقص ہے، لیکن آئندہ بحث میں حتی الامکان اسی کو نقل کیا گیا ہے۔ قارئین اگر عبارت میں کوئی بے ربطی یا اُلجھاؤ محسوس کریں تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیں۔

کے معاشی و معاشرتی حالات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کے نمائشی مہر مقرر کر دیتے ہیں اور فریقین کے اولیاء و اعزہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جتنا مہر چاہو باندھ دو، کون دیتا کون لیتا ہے؟ اس طرح کے بے شمار بھاری بھرکم مہر ایسے ہیں جو ابھی تک واجب الادا ہیں اور جن کا اندراج دستاویزات یا نکاح خوانوں کے رجسٹروں میں موجود ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مہر بلاشبہ ادا ہونے چاہییں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ طلاق کی صورت میں ان کی عدم ادائیگی کو اگر ایسا فوجداری جرم بنا دیا گیا جس کی سزا تین ماہ قید بھی ہو سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ناچاقی کی صورت میں خاوند طلاق دینے کے بجائے بیویوں کو معلق رکھ چھوڑیں گے۔ اس لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں جو قانون بھی بنایا جائے اس کا اطلاق ان نکاحوں پر نہ ہونا چاہیے جو نفاذ قانون سے پہلے منعقد ہو چکے ہیں۔ آئندہ کے لیے اگر عدم ادائی مہر کو فوجداری جرم بنانا ہو تو نکاح ناموں میں اس جرم کی فوجداری نوعیت اور اس کی سزا کو نمایاں طور پر درج ہونا چاہیے اور نکاح خوانوں کو ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ اس اندراج کو نکاح باندھنے سے پہلے مجلس ایجاب و قبول میں پڑھ کر سنا دیں، اور یہ واضح کر دیں کہ ناچاقی کی صورت میں علیحدگی ہونے پر اگر ایک مہینے کے اندر مہر ادا نہ کیا گیا تو شوہر کو جیل جانا ہوگا۔

رپورٹ کی دفعہ ۳۸ میں مجوزہ سفارش کا دوسرا قابلِ اعتراض پہلو یہ ہے کہ اس میں مہر کی عدم ادائیگی کے ساتھ ساتھ "جہیز کی واپسی" کو بھی جرم فوجداری مستلزم سزا قرار دے دیا گیا ہے، گویا کہ یہ بات آپ سے آپ فرض کر لی گئی ہے کہ جہیز جتنا اور جس صورت میں بھی بیوی کو دیا گیا ہو وہ ہمیشہ شوہر ہی کے قبضے میں رہے گا اور اس کی بلا کم و کاست واپسی کی قانونی ذمہ داری شوہر پر ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علی الاطلاق یہ مفروضہ قائم کر لینا اور اس کے بل پر جہیز واپس نہ کرنے کو جرم بنا دینا خاوندوں کے ساتھ صریح زیادتی ہے۔ جہاں تک مہر کا تعلق ہے، یہ بلاشبہ بیوی کا ایک مالی حق ہے جو خاوند کے ذمے بہر صورت واجب ہے اور اسے انعقادِ نکاح کے وقت ہی ادا ہو جانا چاہیے۔ اُس وقت ادا نہ ہو تو عورت جب چاہے اسے طلب کر سکتی ہے اور قانون سے بھی اعانت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن جہیز کوئی ایسی شے نہیں جو ہر حالت میں شوہر ہی کے تصرف میں رہے اور وہ مدت العمر اس کی بجنسہٖ واپسی کا ذمہ دار ہو۔ جہیز بالعموم اشیائے منقولہ مثلاً برتن، نقدی، زیور، پارچات، فرنیچر وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے جو بیوی کے زیرِ استعمال رہتی ہیں اور وہ اپنی اصل حالت و مقدار کے مطابق باقی نہیں رہ سکتیں۔ عورت انہیں جہاں چاہے لے جا سکتی ہے، جسے چاہے دے سکتی ہے، اپنے میکے لے جا کر رکھ سکتی

ہے۔ ایسی بیوی شاید ہی مل سکے گی جو پورا جہیز خاوند کے حوالے کر دے اور ایسا خاوند مشکل ہی سے دستیاب ہوگا جو بیوی کا سارا جہیز صندوق یا کمرے میں مقفل کر دے اور بیوی کو ہاتھ تک نہ لگانے دے اور نہ خود کسی چیز کو ہاتھ لگائے، حتٰی کہ خدا نخواستہ طلاق کی نوبت آجائے اور جرمانہ و قید کی سزا سے ڈر کر وہ قفل کی کنجی بیوی کی تحویل میں دے دے۔

جہیز کے متعلق حال ہی میں ایک بل قومی اسمبلی میں پاس ہوا ہے جس میں اسی طرح جہیز کے متعلق غیر معقول اور ناقابلِ عمل قسم کی پابندیاں لگائی گئی ہیں، مثلاً نکاح کے وقت جملہ اجزائے جہیز کی نمائش مجلس نکاح میں کی جائے، اُن کی فہرست زوجین کے دستخطوں کے ساتھ نکاح خواں تیار کرے اور اسے ضلعی حکام کے دفتر میں جمع کرائے، اگر اس کی خلاف ورزی ہو یا جہیز حدِ مقرر سے زاید ہو تو والدین کو سزا دی جائے۔ اب حقوق نسواں کمیٹی جہیز سے متعلق جو سفارش کر رہی ہے، اس کے بعد غالباً یہ اضافہ بھی کرنا ہوگا کہ میاں بیوی دونوں ایک مدتِ معینہ (مثلاً ہر سہ ماہی یا ششماہی) کے بعد ایک گوشوارہ رجسٹرار نکاح یا دوسرے حکام کے پاس جمع کرائیں اور اس میں بتائیں کہ جہیز کا کتنا حصہ میاں کے قبضے میں ہے اور کتنا بیوی لے چکی یا استعمال کر چکی ہے۔ اس کے بغیر کسی خاص مرحلے پر اگر جہیز کا جھگڑا مقدمے کی صورت میں عدالت کے سامنے جائے گا تو عدالت کے پاس یہ معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہوگا کہ اتنا جہیز خاوند کے پاس تھا جو اس نے بیوی کو نہیں دیا اور اب عدم ادائیگی کے جرم میں وہ جرمانہ یا قید کا مستحق ہے؟ اس طرح کی بے تکی قانون سازی کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ عوام الناس کو قانون شکنی، حیلہ بازی، جعل سازی اور فضول مقدمہ بازی کی عادت ڈالی جائے اور ان کی گھریلو زندگی کو دائمی کشاکش کی آماجگاہ بنایا جائے۔

خاوند کو "واپسی جہیز" کا قانوناً مکلّف و مسئول بنا دینے کے بعد کمیٹی نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا ہے اور دفعہ نمبر ۲ میں مطلقہ عورت کو طلاق دہندہ کی جائداد میں بھی حصہ دار بنا دینے کی سفارش کر دی ہے۔ یہ دفعہ چونکہ نہایت اہم اور دُور رس نتائج پر مبنی ہے اس لیے ہم قارئین سے معذرت کے ساتھ اس پوری دفعہ کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ ترجمہ وہی ہے جو وزارت قانون نے کرایا ہے اور وہ یہ ہے:

"کمیٹی شوہر کو قانون کے تحت میسّر طلاق کے حق پر کچھ پابندیاں عائد کرنے کے سوال پر بھی غور کرتی رہی

ہے کیونکہ خاصی زیادہ صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ شوہر بغیر کسی مناسب اور معقول سبب کے اپنے طلاق کے حق کو استعمال کر کے رشتۂ ازدواج ختم کر دیتا ہے۔ بعض اوقات شوہر کی طرف سے (بستر مرگ پر بھی) یہ حق اس خیال کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد بیوی کو اس کی جائداد میں سے حصّہ کا دعویٰ کرنے سے محروم کر دیا جائے خاص طور پر جبکہ زوجہ کی کوئی اولاد نہ ہو۔ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ شوہر کی طرف سے استعمال کردہ طلاق کے حق کو یہ حکم وضع کر کے روکا جائے کہ زوجہ کو مہر کی ادائیگی اور جہیز کی واپسی کے علاوہ شوہر کو حکم دیا جائے کہ اسے معاوضہ بھی دے جبکہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پانچ سال سے زیادہ اس کی بیوی کی حیثیت سے رہ چکی ہو۔ لہٰذا کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ:

> اگر زوجہ شادی کے بعد پانچ سال یا زیادہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہ چکی ہو، تب شوہر کی طرف سے طلاق کے مؤثر ہو جانے کی صورت میں، وہ شوہر کی جائداد (منقولہ و غیر منقولہ) میں ½ حصّہ وصول کرنے کی مستحق ہوگی۔"

اس دفعہ کو نقل کر دینے کے بعد ہم پہلا سوال جو کمیٹی کے ارکان، بالخصوص اس کے فاضل صدر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق جب آپ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کرنا چاہتے جو قرآن و سنّت کے مخالف ہو تو آپ براہ کرم بتائیں کہ مطلقہ کو اپنے سابق شوہر کی جائداد میں حصّہ دار بنانے کی دلیل کتاب و سنّت کے کس مقام پر مذکور یا کس جگہ سے ماخوذ ہے؟ پہلے جب آپ نے عورت کو یہ حق عطا کرنے کی سفارش فرمائی کہ وہ بیک جنبش قلم ایک نوٹس کے ذریعے سے عقدِ نکاح پر خط تنسیخ کھینچ دے تو اس وقت آپ نے کم از کم ایک آیت، ایک حدیث اور ایک فقہی قول تو پیش کیا۔ مگر جب طلاق کے بعد بھی مطلقہ کو آپ نے طلاق دہندہ کی جائداد میں حصّہ دار بنانا چاہا تو آپ نے کوئی دلیل برائے نام بھی اسلامی تعلیمات کی رُو سے نہ دی۔ بس آپ نے شوہر کے حق طلاق پر پابندی کے مسئلے پر غور و خوض کیا اور اس کے بعد یہ تجویز مرتب کر دی۔ اگر آپ کے پیش نظر حق طلاق پر پابندی اور اس کے ناجائز استعمال کی روک تھام ہے تو طلاق بذریعہ نوٹس کا جو حق آپ بیوی کو دلوانا چاہتے ہیں کیا اس حق کا غلط استعمال نہیں ہو سکتا؟ اور کیا اس پر پابندی لگانا ضروری نہیں؟ پھر اُس وقت آپ نے شوہر کو اپنی مطلقہ بیوی کی جائداد، جہیز وغیرہ میں سے کیوں حصّہ دلوانا تجویز نہیں کیا؟

اصل بات یہ ہے کہ مغربی تمدن اور اہل مغرب کے طور طریقے بعض حضرات کے لیے ایک آئیڈیل اور مثال کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ وہاں چونکہ یہی رسم اور یہی قانون رائج ہے کہ عورت مرد سے طلاق لینے یا اسے طلاق دینے کے بعد بھی اس سے خرچہ وصول کرتی ہے اور بقیہ مہلتِ حیات سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے روشنی و ترقی کا تقاضا یہی ہے کہ اسی اصول کو یہاں بھی نافذ کیا جائے۔ ۱/۸ کی جو مقدار تجویز کی گئی ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ صاحبِ اولاد متوفّٰی کی بیوہ کا ۱/۸ حصہ جو قرآن میں مقرر کیا گیا ہے شاید قیاس یا اجتہاد کے بل پر وہیں سے مطلقہ کو بھی سابق شوہر کی جائداد کا وارث جاننے کا قاعدہ اخذ کیا گیا ہو۔ اگر ایسا کوئی تصوّر ارکانِ کمیٹی کے ذہن میں ہو تو یہ بالکل فاسد و باطل ہے۔ اسلام کسی شخص کی زندگی میں کسی کو کسی کا وارث نہیں بناتا خواہ وہ مُورِث سے نسبی قرابت ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بوڑھے والدین اور بالغ و بے سہارا اولاد جسے گھر سے نکال دیا گیا ہو وہ اس کے زیادہ مستحق تھے کہ وہ صاحبِ جائداد بیٹے یا باپ کے وارث اس کی حینِ حیات ہی بن جاتے۔ لیکن مغربی ممالک میں چونکہ ضعیف والدین اپنی خوشحال اولاد کی کمائی سے حصہ پانے کے بجائے دارالغربا اور دارالضعفا میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، اس لیے ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہمارے ہاں بھی کوئی کمیٹی نہیں بیٹھے گی۔ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کو گھر سے رخصت کر دیا جاتا ہے اور پھر پلٹ کر ان کی خبر بھی نہیں لی جاتی کہ وہ کس حال میں گذر کر رہے ہیں، لیکن چونکہ وہاں والدین کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد میں سے ان کو حصہ نہیں دلوایا جاتا اس لیے یہاں بھی ایسی کسی تجویز پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ البتہ مغرب میں چونکہ مطلقات اپنے شوہروں کے خرچے پر دادِ عیش دے رہی ہیں، اس لیے یہاں بھی ان کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے ورنہ ہم اور بالخصوص ہمارے ان کی روشنی خیال بیگمات بین الاقوامی کانفرنسوں میں کیا منہ دکھائیں گی؟

بہر کیف مطلقہ کے لیے یہ ۱/۸ حصہ جائداد مقرر کرنے کا کوئی بعید ترین تعلق یا واسطہ بھی اسلامی قانونِ میراث سے نہیں ہے۔ میراث کا حق صرف ترکے میں پیدا ہوتا ہے اور ترکہ وہ ہے جسے مرنے والا مرتے وقت چھوڑے۔ پھر ترکے میں حق کسی کی احتیاج کی بنا پر نہیں بلکہ قرابت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ نسبی قرابت (مثلاً والدین، اولاد، بھائی بہن کی قرابت) دائمی ہے مگر ازدواجی قرابت عارضی ہے جو طلاق، خلع یا فسخِ نکاح کی صورت میں منقطع ہو جاتی ہے۔ اس کے منقطع ہو جانے پر نہ عورت مرد کی وارث بن سکتی ہے نہ مرد عورت کا وارث ہو سکتا ہے۔ مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد میں سے حصہ دلوانے سے شرعی ورثاء کی لازماً حق تلفی

(باقی بر صفحہ ۴۵)

سنہ ۶ بعدِ بعثت سے سنہ ۱۰ بعدِ بعثت تک

(۲)

مُقاطعہ کا خاتمہ کس طرح ہوا کفارِ مکہ کے سربرآوردہ اور ضدی سرداروں نے اگرچہ وقتی طور پر غصہ دلا کر اپنے شہر کے دو بڑے خاندانوں کا مقاطعہ باقی سب خاندانوں سے کرا لیا تھا، مگر مکہ میں کوئی خاندان بھی ایسا نہ تھا جس کی رشتہ داریاں بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب کے ساتھ نہ ہوں۔ اس لیے ابتدا ہی سے متعدد لوگوں کو اپنے بھائی بندوں کا یہ مُقاطعہ ناگوار تھا اور جوں جوں یہ طویل ہوتا گیا، اس کے خلاف جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، کیونکہ بنی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی، ان کے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آس پاس کے محلوں تک پہنچ رہی تھیں، اور دوسرے خاندانوں میں اُن کے رشتہ دار، جو پڑوس ہی میں رہتے تھے، ان آوازوں کو سُن سُن کر بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ موسیٰ بن عُقبہ کا بیان ہے کہ تیسرے سال کے اختتام پر بنی عبدِمناف، بنی قُصَیّ اور دوسرے اُن لوگوں نے جن کے شادی بیاہ کے رشتے بنی ہاشم سے تھے ایک دوسرے کو ملامت کی اور صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ یہ قطع رحمی ہے جو ہم نے کی۔ یہ حرکت کر کے ہم نے خاندانی حقوق کا استخفاف کیا ہے۔

طَبَرِی اور ابنِ ہِشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اور بَلاذُری نے واقِدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آخرکار ہِشام بن عَمْرو العامری اِس کام کا بیڑا لے کر اُٹھا کہ وہ اس مقاطعے کا خاتمہ کرا کے چھوڑے گا۔ سب سے پہلے وہ بنی مخزوم کے رئیس، زُہَیر بن ابی اُمَیّہ سے ملا جو حضرت ام سَلَمہؓ کا بھائی اور حضورؐ کی پھوپھی عاتِکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا تھا۔ اس نے کہا، اے زُہیر! کیا تم اس سے خوش ہو کہ اطمینان سے کھاؤ، پیو، شادیاں کرو، اور تمہاری ننھیال کے لوگ بھوکے مریں، ان سے لین دین کا مقاطعہ کیا جائے اور ان سے شادی بیاہ کے رشتے توڑ لیے جائیں؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر معاملہ ابوالحکم بن ہِشام (ابوجہل) کا ہوتا، اور تم نے اس کی ننھیال کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کی دعوت دی ہوتی جو اُس نے تمہاری ننھیال کے ساتھ کرنے کی دعوت دی ہے، تو وہ ہرگز نہ مانتا۔ زُہَیر نے کہا، ہشام، میں اکیلا آدمی کیا

کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہوتا تو میں مقاطعہ کی دستاویز کو پھاڑ ڈالے بغیر نہ چھوڑتا۔ ہشام نے کہا ایک آدمی ساتھ دینے والا تو میں موجود ہوں۔ زُہَیر نے کہا ایک اور آدمی تلاش کرو۔

پھر ہشام بنی نوفل بن عبدِ مَناف کے سردار مُطعِم بن عَدِی کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ اے مُطعِم کیا تم راضی ہو کہ بنی عبدِ مَناف کے دو خانوادے ہلاک ہو جائیں اور تم تماشا دیکھتے رہو؟ اگر اُن کے معاملہ میں تم نے قریش کا ساتھ دیا اور قریش کو اس طرح اُن کا خاتمہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو جلدی ہی ایک دن یہی کچھ تمہارے ساتھ ہو گا۔ اُس نے کہا میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ کسی اور کو ساتھ ملاؤ۔ ہشام نے کہا، ایک میں ہوں اور دوسرا زُہیر بن ابی امیہ۔ مطعم نے کہا ایک اور ساتھی ڈھونڈو۔

اس کے بعد ہشام بنی اسد بن عبد العُزّٰی کے سردار ابو البَختَری عاص بن ہاشم سے ملا اور اس سے بھی وہی باتیں کہیں جو مُطعِم سے کہی تھیں۔ اُس نے پوچھا کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہے؟ ہشام نے کہا میں ہوں، زُہیر بن ابی اُمیہ ہے، اور مُطعِم بن عدی ہے۔ اس نے کہا بس ایک اور آدمی کو ساتھ ملا لو۔ چنانچہ ہشام نے زَمْعَہ بن الاَسْوَد بن المُطَّلِب سے بات کی جو بنی اسد بن عبد العزّٰی ہی کے سرداروں میں سے ایک تھا، اور اسے بھی اس کام کے لیے ہموار کر لیا۔

پھر یہ پانچوں آدمی رات کے وقت مکہ کے بالائی مقام حَجُون پر ملے اور آپس میں طے کیا کہ کس طرح مقاطعہ کی دستاویز کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ زُہَیر نے کہا کہ میں بات کی ابتدا کروں گا اور تم لوگ میرا ساتھ دینا۔ دوسرے روز صبح کو یہ لوگ قریش کی مجلسوں کی طرف گئے اور زُہیر نے کعبہ کے سات طواف کرنے کے بعد مکہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہل مکہ، کیا ہم کھائیں پئیں اور کپڑے پہنیں اس حال میں کہ بنی ہاشم ہلاک ہو رہے ہیں؟ نہ اُن سے کچھ خریدا جاتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھ کچھ فروخت کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم، میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک اس ظالمانہ مقاطعہ کی دستاویز پھاڑ نہ دی جائے۔" ابو جہل نے پکار کر کہا، "تم نے جھوٹ کہا، وہ ہرگز نہ پھاڑی جائے گی۔" زَمْعَہ بولا "واللہ، تم سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو۔ ہم اُس وقت بھی راضی نہ تھے جب یہ دستاویز لکھی گئی تھی۔" ابو البَختَری نے تائیداً کہا "زمعہ سچ کہتے ہیں، اُس دستاویز میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ہم اُس پر ہرگز راضی نہیں ہیں اور نہ اُس کا اقرار کرتے ہیں۔" مُطعِم بن عَدِی نے کہا "تم دونوں سچے ہو اور جھوٹا ہے وہ جو اس کے سوا کچھ کہتا ہے۔ ہم اللہ کے سامنے اِس دستاویز سے، اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔" ہِشام بن عَمْرو

نے بھی اس کی تائید کی۔ اس پر ابوجہل نے کہا کہ " یہ ایک سازش ہے جو رات کو کسی اور جگہ بیٹھ کر تیار کی گئی ہے ۔

قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب کرشمہ

ابن سعد اور ابن ہشام اور بلاذری نے لکھا ہے کہ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے خبر دی گئی کہ مقاطعہ کی دستاویز میں جَور و ظلم اور قطع رحمی کا جو مضمون لکھا گیا تھا اُس سب کو دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے (ابن اسحٰق، موسیٰ بن عُقبہ اور عروہ کا بیان اس کے برعکس یہ ہے کہ اللہ کا نام جہاں تھا اس جگہ کو دیمک نے چاٹ لیا ہے اور صرف ظلم اور قطع رحمی کا مضمون باقی رہ گیا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی اور صحیح بات وہی ہے جو ابن سعد بلاذری اور ابن ہشام نے لکھی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر اپنے چچا ابوطالب سے کیا۔ اُنہوں نے پوچھا " کیا تمہارے رب نے تمہیں اس کی خبر دی ہے "؟ حضورؐ نے فرمایا " جی ہاں "۔ ابوطالب نے اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے کیا۔ اُنہوں نے کہا آپ کا کیا خیال ہے؟ ابوطالب نے کہا واللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی مجھ سے کوئی بات جھوٹی نہیں کہی ہے۔ پھر ابوطالب نے پوچھا، اب کیا کرنا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے بہترین کپڑے پہن کر قریش کی طرف نکلیں اور ان کو یہ بات بتائیں۔ چنانچہ سب نکلے اور حِجر میں گئے جہاں قریش کے بڑے اور دانا لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو آتے دیکھ کر سب حاضرین کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ مورخین نے اس بات کی تصریح نہیں کی ہے، لیکن پچھلی روایت اور اس دوسری روایت کو ملا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب اور ان کے ساتھی عین اُس وقت حرم میں پہنچے ہوں گے جب زُہیر اور اس کے ساتھیوں کا ابوجہل سے جھگڑا ہو رہا تھا اور قریش کے سرداروں کا مجمع اس قضیے پر غور کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ابوطالب نے وہاں پہنچتے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے کہا " ہم ایک بات لے کر آئے ہیں، اس کا وہ جواب دو جو تمہارے نزدیک درست ہو "۔ سردارانِ قریش نے کہا " خوش آمدید، اہلاً و سہلاً "، ہمارے پاس وہ بات ہے جو آپ کو خوش کرنے والی ہو۔ آپ کیا چاہتے ہیں "۔ ابوطالب نے کہا " میرے بھتیجے نے مجھے یہ خبر دی ہے، اور خدا کی قسم وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اب تم وہ صحیفہ منگوا کر دیکھو۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ہے تو ہمارے ساتھ اپنی قطع رحمی سے باز آ جاؤ اور جو کچھ اس صحیفے میں تم نے لکھا تھا اسے ختم کر دو۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا، پھر تمہیں اختیار ہے، چاہو قتل کر دو، چاہو زندہ

رہنے دو۔" انہوں نے کہا آپ نے یہ انصاف کی بات کہی ہے۔ پھر وہ صحیفہ منگوایا گیا۔ کھول کر دیکھا تو بات وہی سچی نکلی جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس پر کفار قریش کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور ان کے سر جھک گئے۔ ابو طالب نے کہا "اب تم پر واضح ہو گیا کہ ظلم اور قطع رحمی اور بدسلوکی کے مرتکب تم ہی ہوئے تھے۔ پھر ہم کس قصور میں محبوس رکھے جائیں؟" پھر ابو طالب اپنے ساتھیوں سمیت کعبہ کے پردوں کے پیچھے گئے اور بیت اللہ کی دیواروں سے لپٹ کر انہوں نے دعا مانگی کہ "خدایا اُن لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما جنہوں نے ہم پر ظلم کیا، ہم سے قطع رحمی کی اور وہ کچھ اپنے لیے حلال کر لیا جو ہمارے معاملے میں اُن پر حرام تھا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ہمراہیوں کو لیے ہوئے اپنی شعب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے اُٹھتے ہی قریش کے بہت سے لوگوں نے اس ظلم پر سخت ملامت کی جو بنی ہاشم پر کیا گیا تھا۔ اُن میں مُطْعِم بن عَدِی، عَدِی بن قیس، زَمْعہ بن اَسْوَد، ابوالبَخْتَری بن ہاشم اور زُہیر بن ابی اُمَیَّہ پیش پیش تھے۔ پھر یہ لوگ ہتھیار بند ہو کر شعبِ ابی طالب میں گئے اور بنی ہاشم اور بنی المطّلِب سے کہا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا کر آباد ہوں۔

ابن سعد، بلاذری اور ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ مقاطعہ کا خاتمہ سنہ بعدِ بعثت میں ہوا۔

حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کی وفات

مقاطعہ اور محصوری کے خاتمے سے حضورؐ کو جو اطمینان نصیب ہوا تھا وہ بہت جلدی پے در پے دو صدموں سے رنج و غم میں تبدیل ہو گیا۔ یہ صدمے حضورؐ کے زبردست حامی و مددگار چچا ابو طالب اور آپ کی انتہائی وفادار و غمگسار بیوی حضرت خَدِیجہؓ کی وفات کے تھے۔ اور یہ دونوں صدمے آپ کو اسی سنہ بعدِ بعثت میں پیش آئے، جس میں مقاطعہ کا خاتمہ ہوا تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات ابوطالب سے پہلے ہوئی (واقدی کی روایت ۳۵ دن پہلے کی ہے)، مگر مشہور اور معتبر بات یہی ہے کہ ابوطالب کا انتقال پہلے ہوا اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ بَیہقیؒ اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کا یہ مجمل بیان نقل کیا ہے کہ ان دونوں کی وفات ہجرت سے تین سال پہلے ایک ہی سال میں ہوئی۔ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ ابوطالب کی وفات شعب سے نکلنے کے ۶ مہینے بعد ہوئی اور اُن کے تین دن بعد حضرت خَدِیجہؓ کا انتقال ہوا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ۱۵ شوال سنہ بعدِ بعثت میں ابوطالب کی وفات ہوئی اور اُس وقت اُن کی عمر ۸۰ سال تھی۔ اس کے ایک مہینہ پانچ دن بعد حضرت خَدِیجہؓ نے وفات پائی، اور اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ابن اَثیرؒ نے ابوطالب کی وفات کو

شوال یا ذی القعدہ سنہ ۱۰ بعد بعثت کا واقعہ بیان کیا ہے، اور مختلف اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اُن کی اور حضرت خدیجہؓ کی وفات میں ۳۵ دن کا فصل تھا۔ حافظ ابو الفرج ابن الجوزی دونوں کی وفات کے درمیان صرف ۵ دن کا اور ابن قُتَیبہ تین دن کا فصل بتاتے ہیں۔ مَواہبُ اللَّدُنِّیَہ میں قسطلانی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ہوئی۔ اور بَلاذُری نے حکیم بن حِزام کے حوالہ سے تاریخ وفات ۱۰ رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت لکھی ہے۔

کفار کی اذیت رسانیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عامُ الحُزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد ایک طرف تو حضورؐ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، اور دوسری طرف یکایک قریش کے لوگ یہ دیکھ کر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پشتیبان اب کوئی نہیں رہا ہے، آپ کے مقابلے میں بہت جری ہو گئے تھے۔ ابوطالب کی زندگی میں جو اذیتیں وہ آپؐ کو نہ پہنچا سکتے تھے، وہ اب انہوں نے پہنچانی شروع کر دیں۔ بَیہقی نے عُروَہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قریش ابوطالب کی وفات تک بزدل بنے رہے"۔ حاکم نے عُروَہ بن زبیر کی یہی روایت انہی الفاظ میں حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے سنا۔

ابن اسحاق نے قریش کی بڑھتی ہوئی جرأتوں کی ایک مثال عروہ بن زبیر کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سرِ بازار حضورؐ کے سرِ مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔ صاحبزادیوں میں سے ایک آپ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں، اور حضورؐ انہیں تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے کہ "رو نہیں میری بیٹی، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے"۔

امام بخاری نے کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجزیہ، کتاب الجہاد اور کتاب المغازی میں متعدد جگہ یہ روایت حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے کہ حضورؐ ایک روز کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے (مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ ابوجہل نے) کہا تم میں سے کون ہے جو جا کر فلاں شخص کے گھر سے ذبح کی ہوئی اُونٹنی (مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جو ایک دن پہلے ذبح کی گئی تھی) کے پیٹ کی آلائش اور اس کا اوجھ اور خون سے لتھڑی ہوئی بچہ دانی اُٹھا لائے اور اس شخص کی پیٹھ پر سجدے کی حالت میں رکھ دے؟ اس پر اُن کا سب سے زیادہ شقی آدمی عُقبہ بن ابی مُعَیط اٹھا اور یہ گندگی لا کر اس نے سجدے کی حالت

میں حضورؐ کی پیٹھ پر یا دونوں کندھوں کے درمیان رکھ دی - اس کے بوجھ کی وجہ سے حضورؐ سجدے ہی میں پڑے رہے، سر نہ اُٹھا سکے - قریش کے لوگ یہ منظر دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے جاتے تھے اور ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے - اتنے میں کسی نے جا کر آپ کے گھر میں یہ خبر پہنچا دی - حضرت فاطمہؓ سن کر دوڑی ہوئی آئیں، اور انہوں نے یہ گندگی کا انبار آپؐ کے اُوپر سے کھینچ کھینچ کر پھینکا، اور پھر قریش کے لوگوں کو مخاطب کر کے انہیں بہت بُری طرح ڈانٹا اور ان لوگوں کو بددُعائیں دیں جنہوں نے یہ حرکت کی تھی (حافظ بزّار نے یہ اضافہ کیا ہے کہ کفار میں سے کسی نے حضرت فاطمہ کو کچھ نہ کہا) - نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا، "خدایا، قریش سے نمٹ لے"۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ بات دو مرتبہ فرمائی اور کسی میں ہے کہ تین مرتبہ فرمائی - بخاری کی روایت ہے کہ حضورؐ کی یہ بددُعا قریش کو بہت شاق گزری، اور مسلم کی روایت ہے کہ حضورؐ کی آواز سن کر اُن لوگوں کی ساری ہنسی رخصت ہو گئی اور وہ آپؐ کی بددُعا سے خوف زدہ ہو گئے - ایک اور روایت میں حضرت عبد اللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضورؐ نے نام لے لے کر ابو جہل، عُتبہ بن ربیعہ، شَیبہ بن ربیعہ، ولید بن عُتبہ بن ربیعہ، اُمیّہ بن خَلَف، عُقبہ بن ابی مُعَیط، اور عُمارہ بن ولید کو بددُعا دی - (اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ امام احمد، نسائی، بزّار، طَبَرانی اور ابو داؤد طَیالِسی وغیرہم نے بھی نقل کیا ہے - طَیالِسی کی روایت میں حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا یہ قول بھی منقول ہوا ہے کہ میں نے حضورؐ کو اُس دن کے سوا کبھی ان لوگوں کے حق میں بددُعا کرتے نہیں سُنا) -

اگرچہ اس حدیث کے روایت کرنے والے محدثین نے یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ کس زمانے میں پیش آیا تھا - لیکن ایک بات اس میں ایسی ہے جو اس کا زمانہ قریب قریب متعین کر دیتی ہے - اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ پر بحالت سجدہ اونٹنی کا اوجھ ڈالے جانے کی اطلاع جب حضورؐ کے گھر پہنچی تو حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور انہوں نے اسے کھینچ کر حضورؐ کے شانوں پر سے اتارا - حضرت فاطمہؓ کے متعلق ابن عبد البرّ نے استیعاب میں لکھا ہے کہ وہ اُس وقت پیدا ہوئی تھیں جب حضورؐ کا سِنِ شریف ۴۱ سال تھا - زُرقانی نے شرح مَواہِب میں اسی کو صحیح کہا ہے - اب ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کم از کم نو سال کی تو ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اس سے کم عمر کی لڑکی کے لیے یہ مشکل تھا کہ آلائش سے بھرا ہوا اُونٹنی کا اوجھ اور بچہ دان کھینچ کر اُتار سکتی - اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ کفار نے یہ بیہودگی اُسی زمانہ میں کی تھی جب

حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کا انتقال ہو چکا تھا۔

ابوطالب کی وصیتیں

علامہ قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اُس کی شرح میں ہشام بن محمد بن السائب کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کے آخری وقت میں قریش کے سردار اُن سے ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے قریش کی خوبیاں اور ان کے فضائل بیان کرنے کے بعد ان سے کہا کہ دیکھو، اس خانہ کعبہ کی تعظیم ملحوظ رکھنا کہ اس میں رب کی خوشنودی ہے۔ صلہ رحمی کرنا۔ ایک دوسرے پہ زیادتی اور حق ماری نہ کرنا۔ دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنا۔ سائل کی حاجت روائی کرنا۔ صداقت اور ادائے امانت کے پابند رہنا۔ پھر اسی سلسلے میں انہوں نے کہا کہ "میں تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا، کیونکہ وہ قریش میں امین اور تمام عرب میں صادق ترین آدمی ہے اور وہ اُن تمام خوبیوں کا جامع ہے جو میں نے تم سے بیان کی ہیں۔ وہ ایسی بات لایا ہے جسے دل مانتا ہے اور زبان لوگوں کی دشمنی کے خوف سے اس کا انکار کرتی ہے۔ مگر خدا کی قسم، میں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے کنگال اور اطراف و نواح کے لوگ اور کمزور لوگ آگے بڑھ کر اُس کی دعوت قبول کر لیں گے، اس کے کلمہ کی تصدیق کریں گے، اُس کے کام کو بڑھائیں گے، اور وہ انہیں لے کر خطرات کے میدان میں کود پڑے گا، اور قریش کے سردار اور اکابر دُم چھلے بن کر رہ جائیں گے۔"

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مرتے وقت ابوطالب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ "تم ہمیشہ بخیر رہو گے جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سنتے رہو گے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے رہو گے۔ لہذا اُس کا اتباع کرو اور اس کی مدد کرو، راہ راست پر رہو گے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "چچا جان، آپ ان لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو کیوں چھوڑے دے رہے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا "مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں موت کے وقت گھبرا کر گھٹ جانے والا قرار دیا جاؤں، اور قریش کے لوگ یہ رائے قائم کریں کہ میں نے صحت کی حالت میں تو اس چیز کو رد کیا اور اب گھبراہٹ میں اسے اختیار کر لیا۔"

ابن سعد نے امام محمد بن سیرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر کہا "بھتیجے، جب میں مر جاؤں تو تم اپنے اخوال (یعنی اپنے دادا کی ننھیال) بنی نجار کے پاس مدینے چلے جانا، کیونکہ وہ اپنے گھروں کی حفاظت میں سب لوگوں سے

بڑھ کر سخت ہیں"۔

ان وصیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کیسے دانا اور صاحب بصیرت آدمی تھے اور ان کی نگاہ کتنی دُور رس تھی۔ خصوصاً مدینہ کے معاملہ میں انہوں نے ہجرت سے تین سال پہلے جو رائے دی تھی، وہ بالآخر نہایت صحیح ثابت ہوئی، حالانکہ اُس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مدینہ ہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثار بستی بنے گا اور وہیں سے حضورؐ کو وہ طاقت فراہم ہو گی جو تمام عرب کو مسخر کر لے گی۔ اسی طرح قریش کے سرداروں سے جو کچھ انہوں نے اُس وقت کہا تھا وہ بھی چند ہی سال بعد حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ دوسرے لوگ حضورؐ کا ساتھ دے کر بازی لے گئے اور یہ سردارانِ قریش پیچھے کی صفوں میں پھینک دیے گئے۔ ابن عبد البرؒ نے اِستیعاب میں حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز قریش کے شیوخ، جن میں سُہیل بن عَمرو اور ابو سفیانؓ جیسے لوگ شامل تھے امیر المومنین سے ملنے کے لیے آئے اور وہ اجازت کے انتظار میں باہر بیٹھے رہے۔ اس دوران میں بلالؓ اور صُہیبؓ اور بعض دوسرے اہل بدر کو اندر بلایا جاتا رہا۔ ابو سفیانؓ نے شکایۃً اپنے ساتھیوں سے کہا کیا وقت آیا ہے کہ ہم جیسے لوگ باہر بیٹھے ہیں اور ان غلاموں کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ اس پر سہیلؓ بن عمرو نے کہا کہ آپ حضرات اس کا شکوہ تو اپنے آپ سے کریں۔ جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو ان لوگوں نے سبقت کی اور آپ لوگ پیچھے بیٹھے رہ گئے۔

ابو لہب حضورؐ کی حمایت کے لیے اُٹھتا ہے اور پھر پلٹ جاتا ہے

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مکے میں جب حضورؐ کے ساتھ لوگوں کی بدسلوکیاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک روز ابو لہب آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔ ابو طالب کی زندگی میں جو کام تم کرتے تھے اسے جاری رکھو۔ لات اور عُزّیٰ کی قسم، میرے جیتے جی کوئی تم پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا"۔ اس کے بعد جب حضورؐ گھر سے باہر نکلے اور ابن الغیطلہ[1] نے سر بازار آپ کے اُوپر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی تو ابو لہب اپنے گھر سے نکل آیا اور اس نے ابن الغیطلہ کی بُری طرح خبر لی۔ اس پر وہ شور مچاتا ہوا بھاگا اور بولا

[1] اس شخص کا اصل نام حارث بن قیس بن عَدِیّ السَّہمی تھا۔ قیس بن عدی کی بیوی بنی مُرّہ کی ایک کاہنہ غَیطَلَہ نامی تھی۔ اس کی ساری اولاد اسی عورت کی نسبت سے غَیاطِلَہ کہلاتی تھی۔

"اے قریش کے لوگو، سنو! ابوعُتبہ بھی دینِ آبائی سے پھر گیا"۔ یہ ہنگامہ سُن کر لوگ ابولہب کے پاس آئے اور ماجرا پوچھا۔ اس نے کہا، میں نے عبدالمطلب کا دین نہیں چھوڑا ہے۔ مگر میں اب اپنے بھتیجے کی حمایت کروں گا کیونکہ اس کا کوئی سرپرست باقی نہیں رہا ہے۔ قریش کے سرداروں نے کہا "یہ تو تم نے بہت اچھا کیا کہ صلہ رحمی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اس کے بعد کچھ روز تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم امن میں رہے اور ابولہب کا لحاظ کر کے لوگوں نے آپ کو ستانا چھوڑ دیا۔ آخر کار ایک دن ابوجہل اور عُقبہ بن ابی مُعیط باہم صلاح مشورہ کر کے ابولہب کے پاس آئے اور اس سے کہا "ذرا اپنے بھتیجے سے یہ تو پوچھ لو کہ اُس کا دادا اور تمہارا باپ عبدالمطلب کہاں جائے گا؟" ابولہب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا "جہاں اُن کی قوم جائے گی وہیں وہ بھی جائیں گے"۔ ابولہب نے اپنے دوستوں کو حضورؐ کا یہ جواب سُنا دیا۔ انہوں نے کہا "اجی، کچھ سمجھے بھی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا باپ جہنم میں جائے گا"۔ ابولہب نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، کیا عبدالمطلب جہنم میں جائیں گے"؟ آپ نے فرمایا "ہاں، اور جو شخص بھی اُس دین پر مرے جس پر عبدالمطلب مرے ہیں وہ جہنم میں جائے گا"۔ یہ سُنتے ہی ابولہب بِھنّا گیا اور تڑخ کر بولا "خدا کی قسم، میں ہمیشہ تیرا دشمن رہوں گا۔ تو سمجھتا ہے کہ عبدالمطلب جہنمی ہیں"۔ اِس طرح چند روز کے لیے جو دشمنِ خدا حق کا حامی بنا تھا وہ اپنی اصلیت کی طرف پلٹ گیا۔

حضرت سَودہ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ گھر میں صرف دو کم سن صاحبزادیاں، حضرت اُم کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ رہ گئی تھیں جن کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپ اُس خطرناک زمانے میں فرائضِ رسالت ادا کرنے کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو یہ صاحبزادیاں گھر میں بے سہارا رہ جاتیں۔ اس لیے آپ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے چند روز بعد حضرت سَودہؓ بنت زمعہ[1] سے، جو ایک سن رسیدہ خاتون تھیں اور لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی تھیں، نکاح کر لیا[2]۔ یہ خاتون بنی عامر بن لُوَیّ میں سے تھیں اور ان کے سابق شوہر

[1] یہ نام زَمْعَہ اور زَمَعَہ دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔

[2] ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نکاح رمضان سنہ بعد بعثت میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہوا تھا اور قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں کہا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان میں ہوئی اور حضرت سَودہؓ سے نکاح شوال میں ہوا۔

سَکرانؓ بن عَمرو اُن کے ابنِ عم اور سُہَیل بن عَمرو کے بھائی تھے ۔ دونوں میاں بیوی قدیم الاسلام تھے اور حَبَشہ کی دوسری ہجرت میں شریک ہوئے تھے ۔ موسیٰ بن عُقبہ اور ابو مَعشَر کا قول ہے کہ حضرت سَکران کا انتقال حَبَشہ ہی میں ہوگیا تھا ۔ مگر محمد بن اسحاق اور واقدی کہتے ہیں کہ وہ حبش سے مکہ واپس آگئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا[1] ۔ ابن سعد نے واقدی سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ حضورؐ نے جب اُن کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے معاملہ میں آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے ۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ کسی کو اپنی طرف سے مقرر کر دو کہ وہ میرے ساتھ تمہارا نکاح کر دے ۔ انہوں نے حضرت حاطِبؓ بن عَمرو بن عبدِ شمس کو، جو سُہَیل بن عَمرو کے بھائی اور قدیم الاسلام تھے، اس غرض کے لیے مقرر کر دیا اور انہوں نے حضورؐ سے اُن کا نکاح کر دیا ۔

اکثر و بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ کے بعد پہلی خاتون یہی تھیں جو حضورؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں اور ان کا نکاح حضرت عائشہؓ سے پہلے ہوا ۔ ابن عبد البَرّ نے قَتادَہ اور ابو عُبید اور امام زُہری کے حوالہ سے یہی بات لکھی ہے ۔ ابن سعد نے بھی اسی کی تصریح کی ہے ۔ اور ابن اسحاق نے حضرت علیؓ بن حُسَینؓ (امام زین العابدین) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ پہلی عورت جن سے حضرت خدیجہؓ بنت خُوَیلِد کے بعد حضورؐ نے نکاح کیا وہ سَودَہؓ بنتِ زَمعَہ تھیں ۔

حضرت عائشہؓ سے نکاح لیکن امام احمد، طبرانی، ابن جریر طبری اور بیہقی نے ایک مفصل روایت اس سے بالکل مختلف نقل کی ہے ۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عثمانؓ بن مَظعون کی بیوی خَولہؓ بنتِ حکیم السُّلَمِیَّہ[2] حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ شادی کریں گے ؟ آپ نے فرمایا کس سے کروں ؟ انہوں نے کہا آپ کنواری چاہیں تو وہ بھی موجود ہے ، بیوہ چاہیں تو وہ بھی حاضر ہے ۔ حضورؐ نے پوچھا کنواری کون ؟ انہوں نے کہا تمام خلق میں جو شخص آپ

---

[1] طبری اور ابن اثیر نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ مکہ سے پھر حبش واپس چلے گئے اور عیسائی ہو کر مرے ۔ لیکن بلاذری نے ابن اسحاق اور واقدی کے قول کی توثیق کی ہے اور خود ابن اثیر نے اپنی کتاب اُسد الغابہ میں تصریح کی ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت تک مسلمان تھے ۔ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا ہے ۔

[2] ابن ہشام اور بعض دوسرے مؤرخین نے ان کا نام خُوَیلَہ لکھا ہے ۔

کو سب سے زیادہ محبوب ہے اُس کی بیٹی یعنی عائشہؓ بنت ابی بکرؓ۔ پھر آپ نے پوچھا اور بیوہ کون؟ انہوں نے عرض کیا سَوْدَہؓ بنت زَمعَہ جو آپ پر ایمان لائیں اور جنہوں نے آپ کی پیروی کی آپ نے فرمایا دونوں جگہ جا کر بات کرو۔

پہلے وہ حضرت ابو بکرؓ کے ہاں گئیں اور ان کی اہلیہ اُمِّ رُوْمانؓ سے کہا کیسی خیر و برکت سے اللہ نے تمہیں نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ حضرت خولہ نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہؓ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ ام رومانؓ نے کہا ابو بکرؓ کو آ جانے دو۔ وہ تشریف لائے تو ام رومان نے ان سے کہا اللہ نے کیسی خیر و برکت سے آپ کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پاس عائشہ کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا کیا وہ اُن کے لیے جائز ہے؟ وہ تو ان کی بھتیجی ہے۔ خولہ حضورؐ کے پاس گئیں اور یہ بات آپ سے عرض کی۔ آپ نے فرمایا ان سے کہو تم میرے دینی بھائی ہو۔ تمہاری بیٹی میرے لیے جائز ہے۔ خولہ نے یہی جواب حضرت ابو بکرؓ کو پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا ذرا انتظار کرو۔ یہ کہہ کر حضرت ابو بکر چلے گئے۔ ام رومان نے خولہ سے کہا مُطعِم بن عدی نے اپنے بیٹے کے لیے عائشہ کو مانگا تھا۔ اور خدا کی قسم ابو بکرؓ نے کبھی کسی سے وعدہ کر کے اس کے خلاف نہیں کیا۔ اُدھر حضرت ابو بکرؓ مُطعِم کے پاس گئے۔ اس کے پاس اس کی بیوی، جو اُس لڑکے کی ماں تھی جس کے لیے مطعم نے پیغام دیا تھا، بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولی اے ابو بکر، ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم اپنے لڑکے کا بیاہ تمہارے ہاں کر دیں تو تم ہمارے لڑکے کو بھی دین سے پھیر دو گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے مطعم سے پوچھا "جو کچھ یہ کہہ رہی ہے یہی تمہارا قول بھی ہے"۔ اس نے کہا وہ یہی کہتی ہے۔ یہ جواب سُن کر حضرت ابو بکرؓ اس کے ہاں سے نکل آئے اور اللہ نے اُس مخمصے سے ان کو نکال دیا جس میں وہ مُطعِم سے وعدہ کر کے پھنس گئے تھے۔ پھر انہوں نے خولہ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے ہاں بلا لاؤ۔ وہ حضورؐ کو بلا لائیں اور حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کر دیا۔ اس وقت وہ ۶ برس کی تھیں۔

اس کے بعد خولہ وہاں سے نکل کر حضرت سَودَہ بنت زَمعَہ کے ہاں گئیں اور کہا کیسی خیر و برکت ہے جس سے اللہ نے تم کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ خولہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا میرے باپ سے اس کا ذکر کرو۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ خولہ اس کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقے پر اسے سلام کر کے پہلے اپنا تعارف

کرایا، اور پھر کہا مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سودہ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اس نے کہا جوڑ تو بہت اچھا ہے، مگر تمہاری سہیلی کیا کہتی ہے؟ خولہ نے کہا وہ بھی اس رشتے کو پسند کرتی ہیں۔ اس نے حضرت سودہ کو بلا کر ان کی مرضی پوچھی، اور جب انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے حضورؐ کو اپنے ہاں بلا کر آپؐ سے اُن کا نکاح کر دیا۔ بعد میں حضرت سودہؓ کا بھائی عَبْد بن زَمْعَہ حج کر کے آیا تو یہ سن کر کہ اُس کی بہن کی شادی حضورؐ سے ہو گئی ہے اُس نے اپنے سر پر خاک ڈالنی شروع کر دی۔ پھر جب یہ صاحب خود مسلمان ہو گئے تو کہتے تھے کہ میں اُس وقت کیسا بیوقوف تھا کہ اپنی بہن سے حضورؐ کے نکاح پر میں نے اپنے سر پر خاک ڈالی۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تاریخ اس روایت سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا تھا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے سنہ ۱۰ بعد بعثت کے ماہ شوال میں جب حضورؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا اُس وقت وہ چھ ۶ برس کی تھیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ حضرت عائشہ شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ۶ سال کی تھیں، تو ہجرت کے وقت ان کی عمر ۹ سال ہونی چاہیے، اور معتبر روایات کی رو سے جب شوال سنہ ۲ ہجری میں ان کی رخصتی ہوئی تو وہ گیارہ سال کی ہونی چاہییں، حالانکہ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا نکاح ۶ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی، اور حافظ ابن حجرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن امام نَوَوی نے تہذیب الاسماء واللُّغات میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں اور علامہ قَسْطَلانی نے مَواہِبُ اللَّدُنِّیَہ میں قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی۔ حافظ بدرالدین عَینی نے عُمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ بدر سے واپس تشریف لانے کے بعد شوال سنہ ۲ھ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ امام نَوَوی اور علامہ عینی، دونوں نے اس قول کو واہی قرار دیا ہے کہ یہ رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی۔ اس کے بعد لازماً دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تو پھر نکاح کی تاریخ کونسی تھی جو حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح ۶ سال اور بوقتِ زِفاف ۹ سال سے مطابقت رکھتی ہو؟ اس کا جواب ہم کو بخاری کی اُس حدیث سے ملتا ہے جو انہوں نے عُرْوَہ بن زبیر کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اس میں حضرت عُرْوَہ کہتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی، دو سال یا اس کے قریب مدت تک تَوَقُّف فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت عائشہ سے نکاح کیا جبکہ وہ ۶ سال کی تھیں، پھر ۹ سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی۔ اس سے حساب بالکل صحیح بیٹھتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ہوا اور زفاف سنہ ۲ ہجری میں ہوا۔ حضرت عُروہ کی یہ روایت اگرچہ مُرسل ہے، لیکن حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ عُروہ چونکہ اس طرح کی روایات حضرت عائشہؓ سے سُن کر ہی بیان کرتے ہیں[1]، اس لیے اسے متّصل کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔

نکاحِ عائشہؓ پر اعتراضات چونکہ یہاں حضرت عائشہ کے نکاح کا ذکر آ گیا ہے اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ اُن اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جائے جو حضورؐ کے اس نکاح پر کیے جاتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ۵۴ - ۵۵ سال کی عمر میں ۹ سال کی ایک لڑکی سے شادی کرنا، اور ۱۸ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ جانا، جبکہ قرآن کی رُو سے اُس کا نکاحِ ثانی بھی کسی شخص سے نہ ہو سکتا ہو، کیا یہ (معاذ اللہ) ظلم نہیں ہے؟ اور کیا اتنے سن رسیدہ آدمی کے لیے اتنی کم سن لڑکی کا نکاح (معاذ اللہ) نفس پرستی کی تعریف میں نہیں آتا؟ اور کیا ۹ سال کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں کسی لڑکی پر ازدواجی زندگی کا بار ڈال دیا جائے؟

دراصل اس قسم کے اعتراضات صرف اُس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کو ایک عام مرد اور ایک عام لڑکی کا نکاح سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ حضورؐ اللہ کے رسول تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لیے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی عظیم ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس انقلابی معاشرے کی تعمیر میں حضور کے ساتھ مل کر اتنا بڑا کام کرنا تھا جتنا دوسری تمام ازواجِ مطہرات سمیت اُس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا، بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کسی رہنما کی بیوی بھی اپنے شوہر کے کام کی تکمیل میں ایسی زبردست مددگار نہیں بنی جیسی حضرت عائشہؓ حضورؐ کی مددگار ثابت ہوئیں۔ اُن کے بچپن میں اُن کی اِن صلاحیتوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اسی بنا پر اپنے رسولؐ کی معیت کے لیے اُن کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ بخاری، باب تزویجِ عائشہ میں ہے کہ حضورؐ نے

---

[1] واضح رہے کہ حضرت عُروہ بن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اس لیے اپنی خالہ صاحبہ کے متعلق جو بات وہ بیان کرتے تھے وہ اُن سے سُن کر ہی بیان کرتے تھے، خواہ روایت بیان کا حوالہ انہوں نے دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

حضرت عائشہ سے فرمایا کہ مجھے خواب میں تم کو دو دفعہ دکھایا گیا اور کہا گیا تھا کہ یہ آپ کی بیوی ہے۔ ترمذی، ابواب المناقب میں ہے کہ جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عائشہ کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپ سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔ پس یہ انتخاب حضورؐ کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تھا، اور اللہ ہی کو یہ معلوم تھا کہ ۹ سال کی اس کمسن لڑکی کو اس کے رسول پاک کے فیضِ تعلیم و تربیت سے سیراب ہو کر اسلامی معاشرے کی تعمیر میں کس قدر عظیم خدمت انجام دینی ہے۔

جو لوگ اس معاملہ میں حضورؐ پر نفس پرستی کا الزام لگاتے ہیں وہ ذرا اپنے ضمیر سے پوچھ کر بتائیں، کیا ایسا شخص نفس پرست ہو سکتا ہے جو پچیس سال کی عمر میں پچاس سال کی عمر تک صرف ایک ایسی بیوی پر قانع رہے جو عمر میں اُس سے ۱۵ سال بڑی ہو؟ جو پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک سن رسیدہ بیوہ سے نکاح کرے اور چار پانچ برس تک صرف اسی پر قناعت کیے رہے؟ جو اگر نفس پرستی کی خاطر شادیاں کرنے والا ہوتا تو معاشرے میں اُسے اتنی زبردست محبوبیت حاصل تھی کہ وہ جتنی اور جیسی خوبصورت باکرہ لڑکیوں سے بیاہ کرنا چاہتا ان کے والدین اپنے لیے فخر و عزت سمجھ کر اس کے حضورؐ پیش کرنے کے لیے تیار ہو جاتے؟ جو اس کے باوجود صرف ایک باکرہ لڑکی کے سوا بعد میں جتنی شادیاں بھی کرے بیوہ یا شوہر دیدہ (ثیّبہ) عورتوں ہی سے کرے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس نوعیت کے اعتراضات کرنے والے اپنے ذہن میں ازدواجی زندگی کا صرف شہوانی تصور ہی رکھتے ہیں۔ ان کے پست ذہن اتنی بلندی تک جا ہی نہیں سکتے کہ اُس عظیم انسان کے مقاصد ازدواج کو سمجھ سکیں جو ایک اعلیٰ و ارفع کام کی مصلحتیں مدِّنظر رکھ کر کچھ خواتین کو اپنی شریکِ زندگی اور شریکِ کار بناتے۔

رہا ظلم کا الزام، تو اس معاملہ میں بھی معترضین بس یہ ایک سادہ سی صورتِ واقعہ پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ ایک سن رسیدہ آدمی نے ۹ سال کی لڑکی سے شادی کر کے ۱۸ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ دیا جبکہ اس کے لیے نکاحِ ثانی کا بھی کوئی امکان نہ تھا اور اسے ساری جوانی بیوگی کے عالم ہی میں گزارنی تھی۔ اس عام سطح سے بلندتر ہو کر یہ لوگ کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہیں کرنا چاہتے کہ جس کارِ عظیم کا فائدہ خلقِ خدا کو کسی محدود زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اور کسی محدود علاقے میں بھی نہیں بلکہ دنیا بھر میں پہنچنے والا ہو، اُس کام میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی جانیں اور ان کے مال کھپ جانا بھی کوئی مہنگا سودا نہیں ہے، کجا کہ صرف ایک خاتون کی جوانی اس میں کھپ جانے کو قربانی کے بجائے ظلم سے تعبیر کیا جائے۔

اور وہ جوانی بھی اگر قربان ہوئی تو صرف اِس معنی میں کہ اُس کو ازدواجی زندگی کے لطف سے محروم ہونا پڑا۔ اِس کے ماسوا کسی اور نقصان کی وہ لوگ نشان دہی نہیں کر سکتے جو اُس بلند پایہ خاتون کی ذات کو پہنچا ہو۔ لیکن دوسری طرف دیکھیے کہ گھریلو زندگی کے تمام خرخشوں اور مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اپنی پوری بقیہ زندگی کو عورتوں اور مردوں میں اسلام اور اس کے احکام و قوانین اور اس کے اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں صرف کر کے اُس عظیم ہستی نے کتنی بے بہا خدمات انجام دیں۔ علمِ حدیث کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے جتنا علمِ دین مسلمانوں کو پہنچا اور فقہِ اسلامی کی معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مقابلے میں عہدِ نبوت کی عورتیں تو درکنار، مرد بھی کم ہی ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو پیش کیا جا سکے۔ اگر حضرت عائشہ حضور کے نکاح میں نہ آتیں اور آپ سے تعلیم و تربیت پانے کا ان کو موقع نہ ملتا، تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے علم کا کتنا بڑا حصہ اُمتِ مسلمہ تک پہنچنے سے رہ جاتا۔ اُن سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں اور وہ صرف احادیث روایت کرنے والی ہی نہ تھیں بلکہ فقیہ اور مفسر اور مجتہد اور مفتی بھی تھیں۔ انہیں بالاتفاق مسلمان عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہہ مانا جاتا ہے۔ اکابر صحابہ ان سے مسائل پوچھتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی بعض مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مدینہ طیبہ کے ان چند علما میں ہوتا تھا جن کے فتوے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ اس بیش بہا اجتماعی فائدے کے مقابلہ میں وہ تھوڑا سا ذاتی نقصان کیا حیثیت رکھتا ہے جو حضرت عائشہؓ کو جوانی میں بیوہ ہو جانے سے پہنچا۔ اور تعجب تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں یہ اعتراض وہ عیسائی حضرات کرتے ہیں جن کے ہاں کسی اجتماعی مفاد کے بغیر محض بے مقصد تجرّد کی زندگی بسر کرنا راہبوں اور راہبات کے لیے صرف قابلِ تعریف ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی خدمات بجا لانے والوں کے لیے لازم بھی ہے۔

پھر جن لوگوں کو ۹ برس کی عمر میں حضرت عائشہؓ کے زِفاف پر اعتراض ہے وہ نہیں جانتے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطری حیثیت سے جب ایک لڑکی کا نشوونما اتنا اچھا ہو کہ اِس عمر میں جسمانی طور پر وہ بالغ ہو چکی ہو تو اس کا شوہر کے پاس جانا بالکل جائز و معقول ہے۔ صرف ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی قانون ہی نکاح کے لیے لڑکی اور لڑکے کی ایک خاص عمر مقرر کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قید صرف جائز ازدواجی تعلق ہی پر پابندی عائد کرتی ہے، خارج از نکاح تعلقاتِ مرد و زن پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ اور بات صرف اِتنی ہی نہیں ہے کہ ایسے قوانین بنانے والوں کو عمرِ نکاح سے پہلے زنا کے ارتکاب پر

کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ عملاً آج ان کے ہاں ۹-۱۰ سال کی لڑکیاں اور لڑکے آزادانہ جنسی عمل کر رہے ہیں، اور اس کے نتیجے میں اگر کوئی لڑکی "کنواری ماں" بن جائے تو اُن کی ساری ہمدردیاں اُسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اُس وقت کوئی اعتراض نہ اُس لڑکی پر ہوتا ہے جو عمرِ نکاح سے پہلے ماں بنی، اور نہ اُس لڑکے پر ہوتا ہے جس نے عمرِ نکاح سے پہلے ایک لڑکی کو ماں بنایا۔ ایسی گھٹیا اخلاقی اقدار رکھنے والے آخر کیا منہ لے کر اسلام کے اِس قانون پر اعتراض کرتے ہیں کہ جسمانی طور پر جو لڑکے اور لڑکیاں بالغ ہوں ان کا نکاح جائز ہے اور اِس کے لیے کسی خاص عمر کی شرط نہیں ہے۔ شادی کے لیے قانوناً ایک عمر مقرر کر دینے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اِس عمر کو پہنچنے سے پہلے عقدِ حلال بہر حال نہیں ہو سکتا، خواہ فعلِ حرام کتنا ہی ہوتا رہے۔

(باقی)

ترکی کی تحریک آزادی اور سعید نُورسی

از جناب ثروت صولت صاحب

پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں روس کی قید سے رہا ہو کر ترکی واپس پہنچنے کے بعد استاد بدیع الزمان سعید نورسی استنبول کے نواح میں چاملیجہ[1] (CAMLICA) کی پہاڑی کے ایک گوشہ میں اپنے بھتیجے اور متبنّٰی عبدالرحمٰن کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی ترکی واپسی پر استنبول کے علمی حلقوں میں مسرت کا اظہار کیا گیا اور شیخ الاسلام مصطفٰے صابری نے ان کو اطلاع دیے بغیر باب مشیخت[2] کے تحت قائم کردہ دارالحکمت الاسلامیہ[3] کا رکن بنا لیا۔ یہ استاد کی علمی صلاحیت کا کھلا اعتراف تھا۔ دارالحکمت اسلامیہ ایک قسم کی علمی اکادمی تھی جس سے اس وقت کے ممتاز اہل علم اسمٰعیل حقی ازمیرلی (۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۶ء)، المالیلی حمدی متوفی ۱۹۴۲ء، عمر فرید قام (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۴ء) اور ترکی کے شاعر اسلام محمد عاکف (۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۶ء) جیسی ہستیاں وابستہ تھیں۔ محمد عاکف اس اکادمی کے سکرٹری تھے۔ استاد کی دارالحکمت اسلامیہ میں شرکت کو ان تمام حضرات نے پسند کیا۔

دارالحکمت اسلامیہ کا کام اگرچہ علمی نوعیت کا تھا لیکن اس منصب کو قبول کرنے میں استاد سعید نورسی کی

---

[1] باسفورس کے کنارے ایشیائی ساحل پر ایک تفریحی مقام ہے۔ چام ترکی میں صنوبر کی قسم کے درختوں یعنی فر اور پائن کو کہتے ہیں۔ چاملیجہ کے معنی چام کے درختوں کا جھنڈ ہیں۔

[2] باب مشیخت، شیخ الاسلام کے دفتر کو کہتے ہیں۔

[3] ترکی میں حال ہی میں دارالحکمت اسلامیہ کی ایک تاریخ شائع ہوئی ہے جس کا نام "آخری دور کی اسلامی اکادمی: دارالحکمت اسلامیہ" ہے۔ یہ کتاب صادق البائرق کی مرتب کردہ ہے اور ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

راہ میں دو مشکلات تھیں۔ اوّل یہ کہ ادارہ سرکاری تھا - اور استاد اس سے وابستگی کو اپنی آزادانہ رائے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ان کی راہ میں دوسری رکاوٹ تنخواہ کا مسئلہ تھا۔ وہ اصولی طور پر اس بات کے خلاف تھے کہ اسلام کی خدمت تنخواہ کے عوض انجام دیں۔ انہوں نے خود کو حق وصداقت، ملت اور وطن کے لیے وقف کر دیا تھا اور وہ اپنی کسی خدمت کا معاوضہ نہیں چاہتے تھے۔ اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ استاد نے بڑے اصرار کے بعد یہ رکنیت منظور کی۔ رکن بن جانے کے بعد بھی ایک مدت تک یہ مسئلہ ان کے لیے اُلجھن کا باعث بنا رہا۔ انہوں نے دارالحکمت سے مستعفی ہونے کی کوشش بھی کی لیکن اپنے عقیدت مندوں کے اصرار پر ارادہ ترک کر دیا اور دارالحکمت میں کام جاری رکھا۔ بہرحال وہ جب تک اس ادارے سے وابستہ رہے انہوں نے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ ان کو اس دوران گراں قدر مشاہرہ ملتا رہا لیکن وہ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے جو علمی مضامین لکھے وہ اشرف ادیب کے مشہور ہفت روزہ "سبیل الرشاد" میں شائع ہوئے۔

دارالحکمت اسلامیہ

استاد کے بھتیجے مرحوم عبدالرحمٰن، جو ایک دلیر اور محنتی عالم بھی تھے اور جن کے ساتھ سعید نورسی رہتے تھے، لکھتے ہیں کہ استاد اپنی تنخواہ میں سے صرف ضرورت کے لائق رکھ لیتے تھے۔ باقی رقم میرے پاس جمع کرا دیتے تھے۔ ایک مدت کے بعد اس جمع شدہ رقم سے انہوں نے اپنی بارہ کتابیں چھپوائیں اور ان کو مفت تقسیم کر دیا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ان کتابوں کو قیمتاً فروخت کیوں نہیں کرتے تو جواب ملا کہ:

> "تنخواہ میں سے میرے لیے صرف قوتِ لایموت (یعنی اتنی روزی کہ موت واقع نہ ہو) کی حد تک جائز ہے۔ باقی رقم ملت کا مال ہے۔ اس طریقے سے (یعنی کتابوں کو مفت تقسیم کر کے) میں اس مال کو ملت کو واپس کر رہا ہوں۔"

دارالحکمت اسلامیہ میں ملازمت کے دوران استاد بدیع الزمان کو بعض اوقات رکاوٹوں اور دباؤ کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا تھا جو ان کے لیے باعث پریشانی ہوتا تھا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر جھکانا نہیں جانتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ سر سے کفن باندھے پھرتے ہیں اور ہر خطرے میں پڑ کر موت سے آنکھیں چار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہر قسم کے سیاسی دباؤ کا فولادی عزم سے مقابلہ کیا، غلط فتووں کا بے خوفی سے جواب دیا، اسلام ملت اور ملک کے خلاف ہر نقصان دہ تحریک کا

مردانہ وار مقابلہ کیا اور اناطولیہ کی تحریک آزادی کی تائید و حمایت کی ۔ انہوں نے تقریریں کیں، مضامین لکھے اور کتابیں شائع کیں۔

استنبول پر اتحادیوں کا قبضہ استنبول میں سعید نورسی کے قیام کا یہ زمانہ نہ صرف ترکی کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا بلکہ استاد کے لیے بھی انتہائی ذہنی پریشانی کا زمانہ تھا ۔ جنگ میں ترکوں کو شکست ہو چکی تھی ۔ ۳۰ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بند کر دی گئی ۔ ۱۲ رجنوری ۱۹۲۰ء کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ہوا اور ۱۶ رمارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہو گئیں ۔ یونانی، ترکی کے مشرقی ساحل پر پہلے ہی فوجیں اتار چکے تھے جو ازمیر اور بروصہ پر قبضہ کرنے کے بعد الیسکی شہر تک بڑھ چکی تھیں ۔ دشمنوں کی کوشش تھی کہ ترکی کو نہ صرف اس کے مقبوضات سے محروم کر دیا جائے بلکہ خود ترکی وطن کے بھی ٹکڑے کر دیے جائیں ۔ ان حالات کی وجہ سے سعید نورسی بہت افسردہ اور ملول رہتے تھے ۔ اسلام کے قلب پر غیروں کے قبضے نے ان کو دیوانہ بنا دیا تھا ۔ وہ رنج و غم میں پیچ و تاب کھا رہے تھے ۔ ہر وقت سوچ اور غور و فکر میں مصروف رہتے اور ساتھیوں سے کہتے : "ان حالات میں میں کیا کر سکتا ہوں ۔ میرے پاس اس درد کی کوئی دوا نہیں ۔ میں اپنے ذاتی رنج و غم کو تو برداشت کر سکتا ہوں، مگر اہلِ اسلام کے مصائب نے مجھ کو کچل کر رکھ دیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ اسلام پر جو ضرب پڑی ہے وہ پوری قوت سے میرے قلب پر پڑی ہے ۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں ۔ مجھے ایک روشنی نظر آتی ہے ۔ ظلم و جبر کے یہ کالے بادل جو عالمِ اسلام پر چھائے ہوئے ہیں چھٹ جائیں گے اور اس کے بعد نور ہی نور پھیل جائے گا۔"[1]

اسی زمانے انگریزوں نے کلیسائے انگلستان کی وساطت سے ترکی کے شیخ الاسلام کی طرف چھ سوالات بھیجے اور درخواست کی کہ ان کا جواب چھ سو الفاظ میں دیا جائے ۔ اس وقت کے شیخ الاسلام نے یہ چھ سوال

---

[1] اقبال نے اسی زمانے میں اپنی نظم شمع و شاعر میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے (بانگ درا)

استاد بدیع الزمان کی طرف بھیج دیے۔ استاد نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ سوالات چھ سو الفاظ میں تو کیا ایک لفظ میں بھی جواب دینے کے لائق نہیں، بلکہ سوال کرنے والوں کے منہ پر تھوک دینا ان کا واحد جواب ہے۔ انگریز اس جواب پر بھڑک اٹھے اور آپ کو سزائے موت دینا چاہی، لیکن اناطولیہ میں تحریک آزادی شروع ہوجانے کی وجہ سے یہ فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔ استاد کا موقف یہ تھا کہ انگریزوں کا بشپ ہم سے ایک ایسے وقت میں سوال کر رہا ہے جبکہ ہماری گردن انگریزوں کے پاؤں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان حالات میں ان سوالوں کا یہی جواب ہوسکتا ہے۔ بہرحال استاد نے مذکورۂ بالا زبانی جواب کے ساتھ چھ سطروں میں ان سوالوں کے جواب بھی شیخ الاسلام کو بھجوا دیے۔ ان میں سے بعض سوال اور ان کے جواب یہ ہیں:

۱۔ سوال: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب کیا ہے؟

جواب: قرآن، اور ایمان کے چھ ارکان، اور اسلام کے پانچ ارکان۔

۲۔ سوال: زندگی میں اس عقیدے (یعنی اسلام) سے کیا مدد ملتی ہے؟

جواب: اتحاد اور صراطِ مستقیم۔

۳۔ سوال: ان عقائد سے انسانیت کا کس طرح علاج ہوسکتا ہے؟

جواب: ربا کو ختم کرکے اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرکے۔

۴۔ سوال: انسانی انتشار کو اسلام کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے؟

جواب: دولت غیر منصفانہ طریقے پر جمع کی جاتی ہے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دی جاتی جو عدل کرنے والے ہوں[1]۔

تحریکِ آزادی: جب اناطولیہ میں تحریکِ آزادی[2] شروع ہوئی تو مقبوضہ استنبول کے شیخ الاسلام دُرّی زادہ نے

---

[1] ماہنامہ "نور" (انگریزی)، شائع کردہ رسالۂ نور انسٹی ٹیوٹ امریکہ۔

[2] مصطفےٰ کمال ۱۹ رمئی ۱۹۱۹ء کو بحیرۂ اسود کی بندرگاہ صامسون (SAMSUN) پہنچے۔ جولائی سے ستمبر تک ارض روم میں اور پھر سیواس میں قومی رہنماؤں کے اجتماعات ہوئے جن میں قومی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء کو انقرہ میں مجلسِ کبیرِ ملّی کا افتتاح ہوا جس نے عثمانی پارلیمنٹ کی جگہ لے لی۔

اس مفہوم کا فتویٰ دیا کہ یہ قومی جدوجہد بادشاہ کے خلاف بغاوت ہے اور اس میں شریک ہونے والے باغی ہیں۔ استاد سعید نورسی نے اس کی مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ ایک ایسی حکومت کا جو مقبوضہ علاقہ میں ہو اور جو انگریزوں کے دباؤ میں ہو اس کا حکم اور وہاں کے علماء کا فتویٰ جائز نہیں۔ دشمن کے خلاف تحریک چلانے والے باغی نہیں ہیں اس لیے یہ فتویٰ واپس لیا جائے۔

اس زمانے میں برطانوی حکومت نے بعض علماء کو بھی اپنا آلۂ کار بنانا چاہا۔ اس نازک موقع پر استاد بدیع الزمان سعید نورسی نے دارالحکمت اسلامیہ کے رکن کی حیثیت سے علماء اور عوام دونوں کو برطانیہ کے عزائم سے خبردار کیا۔ انہوں نے تحریک آزادی کو تقویت دینے کے لیے تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "الخطوات الستہ" نامی کتابچے کی تصنیف ہے۔ یہ کتابچہ خفیہ طریقہ پر شائع کیا گیا اور استاد کے بھتیجے اور ترک طلبہ نے اس کو عوام میں پھیلایا۔ اس کتابچے نے برطانوی منصوبے کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اس کو ناکام بنا دیا۔ کتاب کا پورا نام "خطوات الستہ فی دسائس و وساوس شیاطین الانس" تھا اور عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔

انقرہ کی حکومت نے استاد کی ان خدمات کو پسندیدہ نظر سے دیکھا۔

استاد نے مقبوضہ استنبول میں رہتے ہوئے جس دلیرانہ انداز میں تحریک آزادی کی حمایت کی اس کا نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ ان کو انقرہ آنے کی دعوت بھی دی گئی۔ لیکن استاد نے اس دعوت نامے کے جواب میں لکھا کہ:

> "میں خطرناک جگہ پر رہ کر جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ پناہ گاہ کے پیچھے رہ کر جہاد کرنا مجھے پسند نہیں۔ یہ جگہ (استنبول) میرے خیال میں زیادہ خطرناک ہے اور یہاں کا کام بھی ابھی نامکمل ہے۔ یہ خطرہ ٹل جانے کے بعد انشاء اللہ انقرہ آؤں گا۔"

انقرہ کی حکومت نے سعید نورسی کو تین مرتبہ دعوت دی۔ بالآخر آپ نے تیسری دعوت قبول کر لی جو ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو انقرہ میں مجلس کبیر ملی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے دی گئی تھی۔ استاد جب انقرہ پہنچے تو ان کا وہاں شاندار استقبال کیا گیا۔ انہوں نے محلہ حاجی بیرم[1] کے نواح میں رہائش اختیار کی۔ مجلس کبیر ملی کا

---

[1] حاجی بیرم، انقرہ کا ایک قدیم محلہ ہے جو ترکی کے ایک مشہور بزرگ حاجی بیرم ولی (۱۳۳۲ء تا ۱۴۲۹ء) کے نام پر حاجی بیرم کہلاتا ہے۔ حاجی بیرم کا مزار اور مسجد بھی اسی محلے میں ہے۔ یہ محلہ انقرہ میں اسلام پسندوں کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

افتتاح ہوا تو ارکانِ مجلس کی درخواست پر آپ نے دعا کی۔

انقرہ میں قیام کے دوران سعید نورسی نے مشرقی ترکی میں اعلیٰ تعلیم کی دینی درس گاہ کے قیام کے مسئلے کو ایک بار پھر اٹھایا۔ اس درس گاہ کا قیام جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس موضوع پر جب مجلس میں بحث ہوئی تو استاد نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"مشرقی صوبے اسلام کے گڑھ ہیں۔ ان کے لیے جدید علوم کی طرح دینی علوم کی بھی ضرورت ہے۔ یہ بات کہ انبیاء زیادہ تر مشرق میں ہوئے ہیں اور فلسفی زیادہ تر مغرب میں، اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ مشرق میں ترقی کی مشین کے لیے جس ایندھن کی ضرورت ہے وہ مذہب ہے۔"

مشرقی ترکی میں چونکہ کُرد آبادی بھی کافی ہے اس لیے استاد نے اس موقع پر خبردار کیا کہ اگر اُن علاقوں میں دینی تعلیم کا بندوبست نہ کیا گیا تو ایک ایسے وقت میں جبکہ ہمیں اتحاد اور باہمی تعاون کی ضرورت ہے، ترکی کے غیر ترک باشندے ترکوں کو خلوصِ دل سے اپنا بھائی نہیں سمجھیں گے۔

ارکان اسمبلی نے استاد کی تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا اور دو سو ارکان میں سے ۱۶۳ ممبروں نے ان کی تجویز منظور کرلی اور مشرقی ترکی میں دینی یونیورسٹی کے لیے ڈیڑھ لاکھ لیرا کی رقم مخصوص کردی۔

استاد سعید نورسی انقرہ آ تو گئے تھے لیکن مجلس ملی میں دین کے خلاف باتوں نے اور شعائرِ اسلام کی طرف سے حکومت کے رہنماؤں اور ارکانِ اسمبلی کے طرزِ عمل اور سرد مہری نے ان کو جلد ہی مایوس کردیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں ارکان اسمبلی کی توجہ نماز کی اہمیت کی طرف مبذول کرائی اور مختلف نصیحتیں کیں۔ اس بیان کی پیشانی پر یہ جملہ درج تھا:

"اے ارکان مجلس یاد رکھو کہ ایک دن تمہیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے"۔

قومی اسمبلی میں اس بیان کو جنرل کاظم قرہ بکر[1] پاشا نے پڑھ کر سنایا۔ اس کا اس قدر اثر ہوا کہ ترکی پارلیمنٹ

---

[1] جنرل کاظم قرہ بکر پاشا ترکی کی جنگ آزادی کے معماروں میں سے ہیں۔ جنگ عظیم کے آخری سالوں میں قفقاز کا محاذ ان ہی کے سپرد تھا۔ چنانچہ ترک ان کو فاتح شرق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کاظم قرہ بکر پہلے شخص تھے جنہوں نے مشرقی ترکی میں آزادی کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۲۳ء میں اس موضوع پر انہوں نے استقلال حرب امیز (ISTIKLAL HARBIMIZ) یعنی "ہماری جنگ آزادی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جسے حکومت ترکی نے اسی سال ضبط کرلیا۔ لیکن اب یہ کتاب پھر شائع ہوگئی (باقی بر صفحہ ۳۱)

میں نماز پڑھنے والے ارکان میں ساٹھ کا اضافہ ہوگیا۔ نماز کا کمرہ چھوٹا پڑگیا اور نماز کے لیے ایک بڑا ہال مخصوص کرنا پڑا۔

مصطفےٰ کمال اور سعید نورسی ایک دن استاد کی مصطفےٰ کمال سے ملاقات ہوگئی۔ مصطفےٰ کمال نے ان سے کہا کہ "ہمیں آپ جیسے دلیر عالم دین کی ضرورت ہے۔ ہم نے آپ کے افکار عالیہ سے استفادہ کرنے کے لیے آپ کو انقرہ بلایا تھا۔ آپ آ بھی گئے۔ لیکن آپ نے کام کا آغاز نماز سے کیا۔ یہ انفرادی فرض ہے۔ کسی کے ضمیر میں مداخلت نہیں کی جا سکتی"۔

استاد سعید نورسی نے جواب میں کہا، "جی ہاں ایسا ہی ہے۔ لیکن میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ جو شخص اللہ کا فرض ادا نہ کرے وہ ملت کے فرائض کو صحیح طور پر انجام دے سکے گا۔ انفرادی صورت میں ہر شخص اپنے ضمیر کے آگے جواب دہ ہے لیکن افراد جب اجتماعی شکل اختیار کرلیں تو فرائض کی نوعیت بھی اجتماعی ہوجاتی ہے۔ ملت کے نمائندوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اعمال کو ملت کے دین کے مطابق ڈھالیں۔ اگر وہ ملت کے دین کے تحفظ میں کوتاہی کریں گے تو وہ جلادت اور شہامت کا مظاہرہ نہیں کرسکیں گے۔ اگر ایک فرد اور بالخصوص قوم کے نمائندے اللہ کی عبادت نہیں کرتے تو پھر ان کو دوسرے بندوں کی عبادت کرنے سے کون سی چیز روک سکے گی؟ اللہ کی عبادت دلوں کو حوصلہ دیتی ہے۔ انسان کو انسان کے آگے جھکنے سے روکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو انسان کے آگے جھکنے سے روکنے کے لیے، اور نمائندگان ملک وقوم کو ہر کسی کا غلام بن کر قوم کے مستقبل سے غفلت نہ برتنے کے لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور فرائض الٰہی کی بجا آوری کریں"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں جب ازمیر میں مصطفےٰ کمال کے قتل کی سازش کا انکشاف ہوا تو حزب اختلاف کی ترقی پرور پارٹی کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ کاظم قرہ بکر کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن جب عدالت نے کوئی ثبوت نہ پایا اور عوام نے ان کی رہائی کے لیے زبردست مظاہرے کیے تو ان کو رہا کردیا گیا۔ مصطفےٰ کمال کے بعد ۱۹۳۹ء میں وہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

لہ حاشیہ صفحہ ہٰذا۔ یہ ملاقات نماز سے متعلق استاد کے بیان کے چند روز بعد ایک اجتماع میں ہوئی تھی جس میں مجلس ملی کے پچاس ساٹھ ارکان موجود تھے۔

مصطفیٰ کمال نے استاد کی تائید کی اور کہا کہ میری بھی خواہش ہے کہ قوم کا ہر نمائندہ اللہ کا اور قوم کا فرض ادا کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد مصطفیٰ کمال اور استاد میں مفاہمت ہو گئی اور قومی اسمبلی نے جامعۂ شرق کے لیے، جسے استاد مشرقی اناطولیہ میں قائم کرنا چاہتے تھے، ایک لاکھ ستر ہزار[1] طلائی لیرا کی جو رقم مخصوص کی تھی وہ مصطفیٰ کمال کی رضامندی سے منظور کی گئی۔

مصطفیٰ کمال کی حکومت نے استاد کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے اور بھی کوششیں کیں۔ مثلاً ان کو مشرقی ترکی کا رئیس المبلغین بنانے، دار الحکمت الاسلامیہ کا صدر بنانے اور رہائش کے لیے ایک شاندار کوٹھی دینے کی پیش کش بھی کی گئی۔ لیکن استاد جانتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کے ضمیر کو خریدنے کے لیے کیا جا رہا ہے، اور انقرہ کی حکومت کے ارکان اسلام کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حکومت مسلسل ایسی کارروائیاں کر رہی تھی جن میں وہ حکام سے تعاون نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ استاد نے یہ تمام پیش کشیں رد کر دیں اور انقرہ چھوڑنے کا عزم کر لیا۔

استاد سعید نورسی جب انقرہ سے رخصت ہوئے تو مجلس کبیر ملی کے بہت سے ارکان ان کو الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک آئے اور انہوں نے استاد کو روکنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن استاد حالات سے اتنے بددل ہو چکے تھے کہ انہوں نے کوئی بات نہیں سنی اور انقرہ سے روانہ ہو گئے۔ وہ ایک بار پھر وان چلے گئے جہاں وہ استنبول جانے سے پہلے اپنی جوانی کے پندرہ بہترین سال گذار چکے تھے۔ یہاں وہ ایرک داغ (EREK DAG) نامی پہاڑ کے دامن میں ایک چشمہ زرنباد سویو (ZERNEBAD SUYU) کے کنارے ایک چھوٹے سے غار میں گوشہ نشین ہو گئے۔

یہ واقعہ ۱۹۲۱ء کا ہے۔

اس کے بعد استاد صرف ایک بار اور انقرہ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ترکوں کو یونانیوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور ترک فتح کا جشن منا رہے تھے۔ لیکن خوشی اور مسرت کے اس موقع پر ہر طرف غیر دینی افکار کا غلبہ دیکھ کر ان کو شدید رنج پہنچا۔ وہ قرآن اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے عربی میں ایک کتاب شائع کرنے کے بعد ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں پھر واپس چلے گئے۔

[1] ترکی کتابوں میں رقم کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہیں ڈیڑھ لاکھ لیرا لکھا ہے اور کہیں ایک لاکھ ستر ہزار لیرا۔

سعید جدید استاد سعید نورسی اب سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو چکے تھے۔ انہوں نے اخبار پڑھنا بھی بند کر دیا۔ اور اپنا تمام وقت عبادت و ریاضت میں یا درس و تدریس میں صرف کرنے لگے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک نیا موڑ تھا۔ اور وہ خود اس دور سے قبل کے سعید کو سعیدِ قدیم اور بعد کے دور کے سعید کو سعیدِ جدید کہنے لگے۔ اس دور کا آغاز انہوں نے اس جملے سے کیا:

اعوذ باللہ من الشیطان والسیاست

یعنی میں شیطان اور سیاست دونوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

استاد بدیع الزمان نورسی ویسے تو فطری طور پر زاہدانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن استنبول میں قیام کے زمانے میں انہوں نے خود کو سیاست میں ملوث کر لیا تھا۔ لیکن اب وہ اس راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ گئے۔ دراصل روس میں قید کے اداس اور افسردہ ماحول کے زمانے ہی میں ان کے خیالات میں تبدیلیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس دنیا کی عارضی زندگی کو وہ بے حقیقت سمجھنے لگے تھے اور وہ اب خود کو زہد و ریاضت کے لیے وقف کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس ذہنی تبدیلی کا حال اپنی کتابوں میں متعدد جگہ بیان کیا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" والگا کے کنارے مسجد میں جو راتیں میں نے گذاریں اُن میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اب مجھے باقی زندگی غاروں میں گزارنی چاہیے۔ کیونکہ بالآخر مجھے قبر کی تاریکی میں جانا ہے۔ اس لیے مجھے خود کو تنہائی کا خوگر بنا لینا چاہیے۔ بدقسمتی سے استنبول میں ملاقاتیوں کی کثرت، دنیوی زندگی کے طمطراق اور اس کی لغویات یعنی شہرت اور اعزازات نے، جن کا میں مستحق نہیں تھا کچھ مدت کے لیے مجھے اپنے اس فیصلے پر عمل کرنے سے غافل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن سے جدائی کی وہ تاریک راتیں (یعنی جو انہوں نے دریائے والگا کے کنارے گزاریں) میرے لیے بڑی روشن تھیں، بالکل اسی طرح جس طرح آنکھ کی پتلی اپنی سیاہی کے باوجود روشنی کا مرکز ہوتی ہے اور استنبول کے دنوں کی شان و شوکت ڈھیلے کی سفیدی کی طرح تھی جس سے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس اندھے پن کی وجہ سے میں راستہ نہیں دیکھ سکا اور پھر دو سال کے لیے سو گیا، یہاں تک کہ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنی کتاب فتوح الغیب کے ذریعے میری آنکھیں پھر کھول دیں[1]۔"

دارالحکمت میں ملازمت کے زمانے میں فتوح الغیب کے جس جملے نے ان کی زندگی کو متاثر کیا وہ

---

[1] تاریخچۂ حیات مرتبہ سعید اوزمیر و تحسین تولا ص ۴۳، ۴۲۔

یہ تھا کہ:

"تم خود ایک مریض ہو اپنے علاج کے لیے کسی طبیب کی تلاش کرو"۔

اسی زمانے میں جب استاد سعید نورسی مکتوبات مجدد الف ثانی کا مطالعہ کر رہے تھے تو ان کو ایک اور شگون مل گیا جس سے فتوح الغیب کے مشورے کو تقویت ملی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے دو مکتوبات اُن کی نظر سے گزرے جو بدیع الزمان نام کے دو آدمیوں کو لکھے گئے تھے۔ ان خطوط میں حضرت مجدد نے ایک کو بدیع الزمان ابن مرزا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ سعید نورسی کے والد کا نام بھی مرزا تھا۔ اس لیے استاد نے اس سے یہ مطلب اخذ کیا کہ یہ خط در اصل خود ان کو لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اس نوعیت کے علاج کے محتاج تھے جس کا محتاج وہ اصل شخص تھا جس کو مجدد الف ثانی نے خط لکھا تھا۔ استاد لکھتے ہیں کہ:

"حضرت مجدد نے اپنے خطوط میں ایک سالک اور رہنما کے تحت زندگی گزارنے کی ہدایت کی ہے اور میں نے اس کی تعمیل میں قرآن کو اپنا رہنما بنا لیا[1]"۔

یہ تھا پس منظر استاد سعید نورسی کی سیاست سے علیحدگی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کا۔ ہو سکتا ہے کہ عہد مشروطیت میں ان کو شریعت کے نام پہ کام کرنے کی جو سزا دی گئی تھی اور جمہوریت کے قیام کے بعد حکومت ترکی نے جو اسلام دشمن طرز عمل اختیار کیا، وہ بھی استاد کے ذہن و فکر پہ اثر انداز ہوا ہو اور انہوں نے نئے ماحول میں سیاسی میدان میں کام کرنے کو ایک کار عبث سمجھ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہو۔

بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو یہ حقیقت ہے کہ استاد سعید نورسی اب سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے ترکی کے ایک دور افتادہ گوشے میں خلوت گزیں ہو چکے تھے۔ لیکن ترکی کی جمہوری حکومت کو ان کی یہ گوشہ نشینی بھی پسند نہیں آئی اور ۱۹۲۵ء میں ان کو وہاں سے نکال کر مغربی ترکی میں جلا وطن کر دیا گیا جہاں ان کو پچیس ۲۵ سال تک طرح طرح کے مصائب اور اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک گوشہ نشین عابد و زاہد کو جس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی کیوں جلا وطن کیا گیا؟ اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ کیوں توڑے گئے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ دیر کے لیے استاد کے حالات سے ہٹ کر اس زمانے کی ترکی کے حالات اور پس منظر پہ نظر ڈالنی ہوگی۔

---

[1] BEDIUZZAMAN SAID NOORSI OF TURKEY

رسائل و مسائل

کیا قرآنی احکام کے جزئیات میں "رد و بدل" ہو سکتا ہے؟

سوال :- میں ایک جوان سال طالب علم ہوں ۱۹۷۰ء سے جماعت اسلامی کا ذہنی ہمدرد اور آپ کا ایک عقیدت مند۔ لیکن آپ کے ساتھ عقیدت ہو یا کسی کے ساتھ دشمنی، میرے پیش نظر ہمیشہ خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث شریف رہتی ہے کہ محبت اور نفرت کا معیار صرف قرآن پاک اور سنت صادقہ پر رکھو۔ میں نے آپ کی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں خدائے واحد کی بارگاہ میں بھی یہ عرض کر سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اسلام کے سمجھنے، شعوری طور پر اس پر عمل کرنے اور اسلام کی خدمت کرنے اور اقامت دین کے مقدس فریضہ کو انجام دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد میں اس مسئلے کی طرف آتا ہوں جس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یہ چیز واقعتہً میرے دل میں کھٹکتی ہے۔ یہ آپ کی وہ تحریر ہے جو آپ کی کتاب "سنت کی آئینی حیثیت" میں مندرج ہے۔ میرے پاس اس کتاب کا مارچ ۱۹۷۵ء کا ایڈیشن ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ "رسول اللہ نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسی قسم کا رد و بدل قرآن کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟" اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ان میں اسی حد تک رد و بدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ اجازت دیتے ہوں۔ اس چیز میں آپ نے قرآن پاک کو بھی شامل کر دیا ہے۔ آپ اپنی کتاب سنت کی آئینی حیثیت کے صفحہ ۱۲۶ پر دیے گئے سوال اور جواب کو دوبارہ پڑھیں۔ میرے خیال میں یہ چیز قرآن پاک کی مستند حیثیت کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ میرے خیال ناقص کے مطابق ہی نہیں، فرمانِ الٰہی کے مطابق بھی کلام پاک ایک محفوظ کتاب ہے۔ جس کے ایک شوشہ میں بھی رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاملہ رفیصلہ سنت ثابتہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ حکم کے مطابق رد و بدل کیا جائے گا۔ اس کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اس تحریر میں "قرآنی احکام کے جزئیات" سے آپ کی مراد کیا ہے ؟

۲۔ اگر اس سے مراد کوئی آیت پاک ہے تو کیا کوئی غیر صاحب وحی اس میں رد و بدل کا مختار ہے ؟

۳۔ رسول اکرمؐ کے تشریف لے جانے کے بعد کیا قرآن پاک کے احکام میں رد و بدل ہو سکتا ہے ؟

۴۔ اور کیا خود رسول اکرمؐ قرآنی احکام کی جزئیات میں اپنی مرضی سے رد و بدل کر سکتے تھے ؟

۵۔ ختم نبوت کے خلاف کیا یہ تحریر ایک ثبوت اور دلیل کی باعث نہیں بنتی ہے ؟

۶۔ آپ نے جو بات لکھی ہے کیا آپ اس کے سلسلے میں قرآن پاک، سنت رسول، یا مسلک ائمہ اربعہ سے ثبوت دے سکتے ہیں ؟

۷۔ اگر کوئی دلیل اس سلسلے میں آپ کے پاس نہیں تو کیا آپ اپنی اس رائے سے رجوع کرنے کے لیے تیار ہیں ؟

۸۔ کیا جماعت اسلامی میں شامل رہنے کے لیے آپ کی تحریروں سے اتفاق ضروری ہے؟

مولانا صاحب، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو بات کا بتنگڑ بنا کر اس کی تشہیر کرتے اور اسے کسی شخص کے خلاف نفرت و حقارت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے حق سمجھ کر لکھا ہے۔ میرا مطالعہ صرف آپ کی کتب تک محدود نہیں بلکہ اس مختصر عمر میں میں نے اسلاف کی مقدس تحریروں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور یہ کتب مطالعہ کرنے اور جذبہ اسلام پیدا کرنے میں آپ کی کتب کا پورا اور ۱۰۰ فی صد حصہ ہے جس کے لیے میں اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے جزائے خیر کا طالب ہوں۔

جواب ۱۔ آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے "سنت کی آئینی حیثیت" کے ایک مقام پر پیدا ہونے والے شکوک کی طرف مجھے توجہ دلائی۔ دراصل میں نے سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہی "رد و بدل" کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس کے سوال میں درج تھے۔ یہ الفاظ بجائے خود تو ضرور شک پیدا کرنے والے ہیں، لیکن میں نے جس عبارت میں ان کو استعمال کیا ہے، اس کو بغور پڑھا جائے تو اس سے کوئی شک پیدا نہیں ہو سکتا۔ میری اصل عبارت یہ ہے۔

"قرآنی احکام کے جزئیات ہوں یا ثابت شدہ سنت رسول کے جزئیات، دونوں کے اندر صرف اسی صورت میں اور اسی حد تک رد و بدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ کسی رد و بدل کی گنجائش دیتے ہوں، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام

میں ردو بدل کی اجازت دیتی ہو۔ اس کے ماسوا کوئی مومن اپنے آپ کو کسی حال میں بھی خدا اور رسول کے احکام میں ردو بدل کر لینے کا مختار و مجاز تصور نہیں کر سکتا۔"

اِس عبارت میں "ردو بدل" سے مراد آزادانہ ردو بدل نہیں ہے، بلکہ حکم کے ایک مفہوم کو چھوڑ کر دوسرا مفہوم لینا ہے جب کہ نص کے الفاظ میں دونوں مفہوموں کی گنجائش پائی جاتی ہو، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام میں ترک و اختیار کی اجازت دیتی ہو۔

میں اِن دونوں باتوں کی وضاحت کے لیے چند نظائر پیش کرتا ہوں:

دیکھیے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ اس آیت میں قروء کے ایک مفہوم کو فقہاء کے ایک گروہ نے، اور دوسرے مفہوم کو دوسرے گروہ نے اختیار کیا، اور یہ ترک و اختیار اس بنا پر صحیح تھا کہ قروء کے لفظ میں دونوں مفہوموں کی گنجائش تھی۔

اِسی طرح تیمم کے احکام بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کے الفاظ استعمال ہوئے تھے۔ ان کے بھی دو مفہوم ہو سکتے تھے جن میں سے ایک کو فقہاء کے ایک گروہ نے اور دوسرے مفہوم کو دوسرے گروہ نے اختیار کیا۔ یہ بھی اس بنا پر درست تھا کہ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں میں سے کسی ایک کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنے کی اجازت دے رہے تھے

اب دوسری بات کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

سورۂ محمد میں اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً۔ اِس میں جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کی بظاہر دو ہی صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔ ایک احسان، دوسری فدیہ۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوا کہ احسان بلا فدیہ رہا کر دینے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور لونڈی غلام بنا کر حسن سلوک کرنے کی صورت میں بھی۔ یہ نظیر موجود نہ ہوتی تو احسان کا ظاہری مفہوم صرف یہی ہو سکتا تھا کہ جنگی قیدیوں کو فدیے کے بغیر ہی بطور احسان رہا کر دیا جائے۔

جنگ قُرَیْظَہ کے موقع پر حضورؐ نے مدینے سے جانے والے مجاہدین کو حکم دیا تھا کہ "عصر کی نماز نہ پڑھنا جب تک بنی قریظہ کی بستی پر نہ پہنچ جاؤ۔" لیکن راستے میں دیر لگ گئی اور عصر کا وقت گذرنے لگا۔ اس موقع پر ایک گروہ نے نماز نہ پڑھی، اور دوسرے گروہ نے پڑھ لی۔ پہلے گروہ نے نماز کو وقت پر ادا کرنے کے قرآنی حکم اور سنت کے تاکیدی احکام کو چھوڑ کر حضورؐ کی نصِ صریح پر عمل کیا جو اِس خاص موقع ہی

کے لیے ارشاد ہوئی تھی۔ اور دوسرے گروہ نے حضورؐ کے ارشاد کا یہ مطلب لیا کہ عصر سے پہلے پہلے بنو قریظہ پہنچ جاؤ"۔ اب چونکہ ہم وہاں نہیں پہنچ سکے ہیں اور نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے اس لیے ہم نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنے کے حکم عام پر عمل کریں گے۔ ان دونوں گروہوں کا معاملہ جب حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے ان میں سے کسی گروہ کے عمل کو بھی غلط نہ قرار دیا، کیونکہ ہر ایک کے حق میں نص موجود تھی۔

اس توضیح کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے پیش کردہ آٹھ سوالات میں سے پہلے سات سوالات کا جواب دینے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ رہا آپ کا آٹھواں سوال، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں شامل ہونے یا شامل رہنے کے لیے میری تحریروں سے اتفاق ہرگز ضروری نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اسی روز کہہ دی تھی جس روز جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی۔

کوّے کی حِلّت و حرمت اور بعض دوسرے مسائل

سوال: ۱۔ کیا کوّے کا گوشت حلال ہے؟ نیز یہ تحریر فرمائیں کہ کون کون سے جانور اور پرندے حرام یا حلال ہیں؟ نیز دُرِّ مختار کا بعض لوگ حوالہ دیتے ہیں کہ اس میں کوّے کے گوشت کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

۲۔ حالیہ بارشوں اور سیلاب کے دوران بعض لوگوں نے مکانوں کی چھتوں پر خوفِ خدا سے اذانیں دیں۔ ایسا کرنا کہاں تک جائز ہے؟ کیا یہ فعل مستحب ہے یا گناہ ہے یا خلاف شرع ہے؟

۳۔ ننگے سر نماز پڑھنا کیسا ہے، جب کہ ٹوپی یا کپڑا موجود ہو؟ کیا کوئی حدیث ایسی ہے جس سے ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز ملتا ہے؟

جواب: (۱) جن جانوروں کی حرمت کے متعلق قرآن پاک یا حدیث صحیح میں تصریح ہے، ان پر تو امت میں اتفاق ہے۔ لیکن جن جانوروں کے بارے میں تصریح نہیں ہے بلکہ اصول بیان کیے گئے ہیں، ان کی حلت و حرمت میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ کوّے کے گوشت کے متعلق در المختار میں لکھا ہے:

ولا یحل ...... الغراب الابقع الذی یاکل الجیف لانہ ملحق بالخبائث قالہ السنف

(ای صاحب تنویر الابصار) ثم قال والخبيث ماتستخبثه الطباع السليمة" اور حلال نہیں ہے ...... وہ کوا جس کے رنگ میں سیاہی اور سفیدی ملی جلی ہو اور جو مُردار کھاتا ہو، کیونکہ وہ خبائث میں شامل ہے۔ یہ بات مصنف (یعنی صاحب تَنْوِیْرُالْاَبْصَار) نے لکھی ہے، پھر کہا ہے کہ خبیث وہ ہے جسے سلیم الطبع لوگ گندا اور ناپاک سمجھتے ہیں"۔

علامہ شامی نے رَدُّالْمُحْتَار میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

اما الغراب الابقع (الذی فیہ بیاض وسواد) والاسود فھو انواع ثلاثۃ، نوع یلتقط الحب ولا یاکل الجیف ولیس بمکروہ، ونوع لایاکل الا الجیف فانہ مکروہ، وھو الذی سماہ المصنف الابقع۔ ونوع یخلط، یاکل الحب مرۃ والجیف اخری، ولم یذکرہ فی الکتاب، وھو غیر مکروہ عندہ (ای ابی حنیفۃ) ومکروہ عند ابی یوسف۔

"ملے جلے رنگ یا سیاہ رنگ کے کوّوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو دانے چگتا ہے اور مُردار نہیں کھاتا۔ وہ مکروہ نہیں ہے۔ دوسرا وہ جو مُردار ہی کھاتا ہے۔ وہ مکروہ ہے اور مصنف نے اُسی کو ملے جلے رنگ کا کوّا کہا ہے۔ تیسرا وہ جو کبھی مُردار کھاتا ہے اور کبھی دانے چگتا ہے۔ مصنّف نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور امام ابویوسف کے نزدیک مکروہ ہے"۔ (ردالمحتار، جلد ۵، ص ۲۶۶)۔

اسی کتاب میں مندرجہ بالا بحث کو آپ دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کون کون سے پرندے حلال ہیں۔

۲۔ سیلاب یا کثرت بارش یا کسی اور آفت کے موقع پر اذانیں دینا مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے، لیکن میرے علم کی حد تک یہ طریقہ کسی سند پر مبنی نہیں ہے، بلکہ غالباً لوگوں نے اسے اللہ تعالیٰ کو مدد کے لیے پکارنے کی ایک صورت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر لوگ اسے مشروع سمجھ کر کریں تو غلط ہے، اور اگر محض اللہ سے فریاد کرنے اور اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی نیت سے کریں تو مباح ہے۔

۳۔ نماز میں سر ڈھانکنے کا کوئی حکم، یا ننگے سر نماز پڑھنے کی کوئی نہی میرے علم میں نہیں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام عمامہ یا ٹوپی پہنے ہوئے ہی نماز پڑھتے تھے۔ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ کے حکم کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز اچھا لباس پہن کر پڑھی جائے، اور ٹوپی یا عمامہ بھی اس میں داخل ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص ننگے سر نماز پڑھے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔

اُسوۂ ابراہیمؑ اور اس کے ناقدین

سوال: حضرت ابراہیمؑ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ اور شیر خوار بچہ کو حکم خداوندی سے وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ دیا۔ جب آپ وہاں سے چلنے لگے تو آپ کی بیوی آپ کے پیچھے دوڑیں اور پوچھتی رہیں آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ خاموش رہے۔ پھر بیوی نے خود ہی کہا، کیا آپ اللہ کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا ہاں۔ اس صبر و ضبط کی پیکر اور اللہ پر بھروسہ کرنے والی خاتون نے یہ سننے کے بعد کسی پریشانی اور کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا اور اس جنگل میں بیٹھ گئی۔

اس واقعہ کے بارے میں "طلوع اسلام" شمارہ فروری ۱۹۷۶ء میں صفحہ ۳۴ پر رقمطراز ہے۔

"یہ واقعہ قرآن شریف میں نہیں تورات میں ہے۔ اور وہیں سے ہماری کتب روایات میں درج کر دیا گیا ہے۔ اور اسی کو مودودی جیسے مفسر عام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ تاکہ سوچ سمجھ سے کام لینے والے طالب علم اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔" براہ کرم فرمایئے کہ طلوع اسلام کی اس بات میں کہاں تک صداقت کا پہلو موجود ہے؟

ایک اور بات جو میرے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اس کی بھی آپ سے تشفی چاہتا ہوں۔

"حضرت ابراہیمؑ اپنی زوجہ ہاجرہ کو چھوڑ کر دوسری بیوی حضرت سارہ کے پاس ملک شام تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ بعد آپ نے چاہا کہ ہاجرہ اور اسماعیلؑ سے ملاقات کر آؤں۔ آپ نے اپنی بیوی سارہؓ سے اجازت مانگی۔ انہوں نے مشروط اجازت دی کہ سواری سے مت اُترنا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور چل کھڑے ہوئے۔ مکہ آئے تو اُس وقت حضرت ہاجرہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت اسماعیلؑ کی بیوی گھر پہ تھیں۔ خود حضرت اسماعیلؑ شکار پہ گئے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کی بیوی سے حال احوال پوچھا۔ اس نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ آپ چلتے وقت یہ کہہ گئے کہ اسماعیل سے کہنا کہ تیرے گھر کی چوکھٹ خراب ہے۔ اس کو بدل دے۔ یہ کہا اور چل دیئے۔ اسماعیلؑ جب گھر واپس آئے تو بیوی نے سارا ماجرا بیان کیا۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری شادی کر لی۔ پھر کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے سے ملاقات کرنا چاہی۔ اپنی بیوی سارہؓ سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے

پہلے کی طرح مشروط اجازت دی۔ آپ مکہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسماعیلؑ پھر بھی گھر میں موجود نہ تھے۔ آپ نے ان کی بیوی سے حال احوال پوچھا۔ اس نے بڑے اچھے انداز میں جواب دیا۔ حتیٰ کہ آپ کا سر تک دھویا۔ آپ جاتے وقت یہ کہہ گئے کہ اسماعیلؑ سے کہنا کہ تیرے گھر کی چوکھٹ عمدہ ہے۔ اسے قائم رکھنا۔ حضرت اسماعیلؑ واپس آئے تو بیوی نے ماجرا بیان کیا۔ آپ نے جواب دیا وہ میرے والد ابراہیمؑ تھے اور تو میرے گھر کی چوکھٹ ہے۔"

اس واقعہ سے حسبِ ذیل اشکالات ذہن میں اُبھرتے ہیں۔

۱۔ کیا یہ واقعہ درست ہے؟

۲۔ اگر درست ہے تو اتنی سی بات پر طلاق دینا محلِ نظر ہے۔

۳۔ قرآن کریم میں حضرت اسماعیلؑ سے متعلق ذبح کا واقعہ مذکور ہے۔ تو پھر وہ کب رونما ہوا جبکہ مذکور الصدر واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔

اُمید ہے آپ زحمت فرما کر جواب دیں گے۔

جواب: (از ملک غلام علی صاحب) حضرت ابراہیمؑ کا بہ قول قرآن مجید میں مذکور ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت وہ یہ دعا مانگ رہے تھے:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ "اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو بے آب و گیاہ وادی میں بسایا ہے"۔ ان الفاظ سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے کو یہاں آباد کیا مگر خود ان کے ساتھ مستقل بود و باش اختیار نہیں کی۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ یوں کہتے کہ میں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہاں سکونت اختیار کی ہے۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ارادے سے انہیں اس بیابان میں لا بسایا ہو۔ دوسری یہ کہ انہوں نے ایسا ہدایتِ خداوندی کے مطابق کیا ہو۔ تورات یا تفسیری و تاریخی روایات نہیں بلکہ صحیح احادیث ہیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اتنا غیر معمولی قدم حکمِ الٰہی کے مطابق اُٹھایا تھا۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں حضرت ابن عباسؓ نے متعدد احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں جو اسی بات کی تائید کرتی ہیں۔ اگر ان احادیث کو مرسل سمجھا جاتے، تب بھی صحابہ کرام کی مراسیل، بالخصوص جو صحیحین میں وارد ہوں، وہ مستند اور قابلِ حجت ہیں۔ ان احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ

جب حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو لے کر اس وادی میں پہنچے ہیں تو وہاں کوئی پانی اور انسانی آبادی نہ تھی - یہاں حضرت ابراہیمؑ نے ماں بیٹے کو چھوڑا، ایک تھیلے میں کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا ان کے پاس رکھ دیا اور چل دیے - حضرت ہاجرہ نے پیچھے سے آواز دی اور پوچھا:

آللہ الذی امرک بھذا؟ قال نعم - قالت اذن لا یضیعنا ثم رجعت -

(کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: ہاں، تو وہ کہنے لگیں، "پھر اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا اور واپس ہوگئیں) -

اسی حدیث میں مزید مذکور ہے کہ جب پانی اور کھجوریں ختم ہوگئیں تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑنے لگیں - جب سات مرتبہ دوڑ کر تھک گئیں تو انہوں نے زمزم کے پاس ایک فرشتہ دیکھا جس نے زمین پر اپنے پر مارے اور پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا - فرشتے نے ان سے کہا: "تم ہرگز ہلاکت کا خوف نہ کرو - یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ لڑکا اور اس کے والد تعمیر کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے اہل و عیال کو کبھی ضائع نہ کرے گا"

قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے بعد یہ کہنا کہ یہ باتیں تورات سے آئی ہیں اور مودودی جیسے مفسرین ان کو عام کر رہے ہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ گولڈ زیہر جیسے یہودی اور دوسرے ملحدین و مستشرقین یہ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی ہر بات تورات، تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات اور اہل کتاب کی زبانی حکایات سے ماخوذ ہیں - ہماری نومسلم بہن مریم جمیلہ نے بیان کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی معلم ایسا تھا جس نے نہایت محنت اور کھینچ تان کر کے قرآن مجید کی بیشتر آیات و قصص سے مماثل عبارتیں اپنے ہاں کی کتابوں سے جمع کر لی تھیں - مشرکین عرب بھی یہی کہتے تھے کہ یہ قرآن تو پرانے قصے کہانیاں (اساطیر الاولین) ہیں جو لکھ لی گئی ہیں اور صبح و شام ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر املا کیا جاتا ہے - مگر اس طرح کی بیہودہ باتوں سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو کیسے مشتبہ بنایا جا سکتا ہے؟ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام اور حضرت ہاجرہ کے یہ ایمان افروز حالات و واقعات محدثین و مفسرین چودہ سو سال سے نقل کرتے چلے آ رہے ہیں اور آج تک کوئی مسلمان انہیں پڑھ کر یا سن کر اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا - البتہ جو "نیا اسلام اب طلوع" ہو رہا ہے اور "سوچ سمجھ سے کام لینے والے طالب علم" جو اس "جدید اسلام" کے گرویدہ ہو رہے ہیں، وہ اس اسلام سے ضرور برگشتہ ہو رہے ہوں گے جو صدیوں سے ہمارے اسلاف کا متعارف و متوارث دین رہا ہے -

بخاری شریف کی احادیث مذکورہ میں یہ بات موجود نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؓ سے اجازت مانگی اور انہوں نے مشروطاً اجازت دی..... بس اتنا مذکور ہے کہ "میں اپنے اہل و عیال کی خیریت معلوم کرنے جارہا ہوں"۔ بخاری میں یہ بھی نہیں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کے گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی بیوی کا جواب جو منقول ہے وہ یہ ہے کہ انا فی جھد و شدۃ (ہم بڑی مصیبت و مشقت کی زندگی بسر کر رہے ہیں)۔ اسی سے حضرت ابراہیمؑ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ جو عورت اس طرح تنگ دستی کی شاکی ہے وہ خانوادۂ نبوت کی ذمہ داریاں نباہنے کی اہل نہیں ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسماعیلؑ اسے علٰحدہ کر کے دوسری کسی خاتون سے نکاح کریں جو صبر و شکر کے ساتھ مشکل حالات میں خاوند کا ساتھ دے اور شکوہ و شکایت نہ کرے۔ چنانچہ دوسری بیوی کے یہ الفاظ اسی حدیث میں منقول ہیں کہ جب ان سے دوسری آمد پہ حضرت ابراہیمؑ نے حال احوال پوچھے تو انہوں نے کہا: "ہم بالکل بخیر و عافیت اور آسودہ حال ہیں" اور انہوں نے اللہ تعالٰی کی حمد و ثنا بیان کی۔ ظاہر ہے کہ ان دو ہی زندگی میں تو کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوتی ہوگی، مگر یہ دوسری خاتون خود صابرہ و قانعہ ہوں گی، اس لیے اس گھرانے کی ہر لحاظ سے اہل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں گھر کی عمدہ چوکھٹ سے تعبیر کیا اور اسے برقرار اور قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی۔

آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اہل و عیال چونکہ دو جگہ آباد تھے، ایک عرب میں اور دوسرے شام میں، اس لیے آپ مستقلاً ایک جگہ نہیں رہ سکتے تھے۔ البتہ دونوں گھروں کی خبرگیری کے لیے وقتاً فوقتاً دونوں مقامات پہ آمد و رفت رکھتے تھے۔ حکم ذبح کا واقعہ حضرت اسماعیل کی شادی سے پہلے کا ہے جبکہ وہ محض بھاگ دوڑ کے قابل ہوئے تھے۔ جب باپ بیٹا اس آزمائش میں کامیاب ہوگئے تو اللہ نے دونوں کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا، اور حضرت اسماعیلؑ متاہل بھی ہوئے۔ صرف دو موقعوں پہ حضرت ابراہیمؑ کی تشریف آوری کے وقت حضرت اسماعیلؑ کا گھر میں موجود نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ ان مواقع سے پہلے یا بعد میں حضرت ابراہیمؑ کبھی ان کی پرسشِ احوال کے لیے آئے ہی نہیں، یا آئے ہیں تو کبھی باپ بیٹے میں ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔

حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے اہل بیت کو اللہ نے ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھا ہے۔ جس کا جی چاہے اس پورے سلسلہ واقعات سے عبرت و موعظت اور روحانی تقویت حاصل کرے اور جس کا جی چاہے اپنے قلبِ مریض میں شک کے کانٹے چبھوتا رہے کہ وہ کیسا خدا تھا جس نے اپنے ایک نبی کو یہ حکم دیا کہ اپنے شیر خوار بچے کو والدہ سمیت لق و دق ویرانے میں چھوڑ آئے۔ جب بچہ نوجوانی کو پہنچنے لگے تو اس کے گلے پہ چھری چلانے کا حکم دے۔ اور یہ کیسے نبی اور نبی کے گھر والے تھے جو بغیر سوچے سمجھے ایسے احکام کو مانتے چلے گئے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

مطبوعات

ماہنامہ محدث لاہور کا رسول نمبر حصہ اوّل و دوم	حصہ اوّل : قیمت : -/۷ روپے حصہ دوم : قیمت : -/۹ روپے صفحات : حصہ اوّل و دوم : ۴۳۲

شائع کردہ : مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶

ماہنامہ محدث لاہور ایک علمی اور دینی ماہنامہ ہے جو باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اور اسلامی تعلیمات کو اپنی حقیقی روح کے ساتھ پھیلانے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ ماہنامہ محدث کا رسول نمبر ہے جو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب مدنی نے، جو اس رسالہ کے مدیرِ اعلیٰ اور ایک عالم و فاضل شخصیت ہیں اس کی تیاری اور ترتیب میں کافی محنت اور حسنِ انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تمام اہلِ ایمان کی محبت کا مرکز و محور ہیں اور سب ان کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فاضل مدیر نے گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر تمام مکتبۂ فکر کے اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کے نتائجِ قلم سے استفادہ کیا ہے اور رسالہ کو ایک مشترک متاع بنا دیا ہے جس سے ہر مکتبۂ فکر کا فرد مستفیض ہو سکتا ہے۔ لکھنے والوں میں چوٹی کے علماء ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس، حافظ نذر احمد، پروفیسر خالد علوی، پروفیسر منظور احسن عباسی وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر مضمون بڑا وقیع اور ندرت کا حامل ہے۔

رسول نمبر کے حصہ دوم میں دو مضمون "نامِ نامی، اسمِ گرامی، محمدؐ، احمدؐ" اور "چہرہ اقدس" اگر پہلے حصہ کی زینت بنتے تو مضامین کی ترتیب زیادہ موزوں ہوتی۔

رسالہ کی کتابت و طباعت عمدہ ہے اور یہ سفید کاغذ پر چھپا ہے۔ ہر اہلِ ایمان کے پاس اس علمی دستاویز کی ایک کاپی ہونا ضروری ہے۔

(بقیہ اشارات) ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شوہر کی وفات کے وقت اس کی جائداد ختم ہو جائے، یا اُس وقت سے کم ہو جائے جب اُس نے مطلقہ کو طلاق دی تھی۔ اس طرح دوسرے وارثوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا یا تھوڑا ملے گا، مگر مطلقہ جس کا کوئی رشتہ شوہر سے باقی نہ رہا تھا وہ ½ ضرور لے جائے گی صرف اس لیے کہ اس نے پانچ برس شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔ پھر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صاحبِ اولاد مُورث کی بیویاں اگر دو ہوں تو وہ مورث کی وفات پر ⅛، ⅛ لیں گی بشرطیکہ جائداد میں سے کچھ موجود ہو۔ مگر کمیٹی کی تجویز کی رُو سے جس عورت کو طلاق دی جا چکی ہے وہ زندگی ہی میں ½ کی وارث بن جائے گی۔ اس پر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عورت کو طلاق دینے کے بعد مرد کسی دوسری عورت سے شادی کرے اور وہ مرتے دم تک اس کی ساتھی رہے تو میراث میں اسے کیا ملے گا؟ انسانی دماغ جب خدائی قانون میں ترمیم کی جسارت کریں تو اس کا نتیجہ بلاشبہ بگاڑ اور حق تلفی ہی کی صورت میں رونما ہوگا خواہ ترمیم کرنے والے اصلاح ہی کا زعم اور دعویٰ رکھتے ہوں۔

رپورٹ کی اس دفعہ ۴ میں اُس مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جملہ جائدادِ منقولہ وغیر منقولہ کے ½ کا وارث بنانے کی سفارش کی گئی ہے جو کم از کم پانچ سال تک اس مرد کے نکاح میں رہ چکی ہو۔ پانچ سال کی مدت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی منکوحہ سنِ یاس کو پہنچ جائے اور نکاح ثانی کے قابل نہ رہے۔ اسلام اس بات کو پسند بھی نہیں کرتا کہ کوئی مطلقہ یا بیوہ یا بن بیاہی عورت بلاوجہ تجرّد ہی کی زندگی بسر کرے، بلکہ اس کے لیے مستحسن یہ ہے کہ وہ شادی کرے اور اس کے اولیاء کو بھی یہی ہدایت دی گئی ہے کہ اس کا نکاح کرا دیں۔ اب پانچ سال قیدِ نکاح میں رہنے کے بعد جس عورت کو کسی بنا پر طلاق مل جائے وہ اگر دوسرا نکاح کرے تو اس کا نان ونفقہ بہرحال دوسرے شوہر کے ذمے واجب ہے۔ اس کے بعد آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ سابق خاوند کی جائداد میں سے بھی حصہ پائے۔ یہ صورت خواہ مغرب کے تمدنی نظریات کی رو سے قابلِ اعتراض نہ ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بالکل بے جواز اور ازدواجی غیرت وحمیت کے بالکل منافی ہے۔ اس حالت میں دوسرا خاوند بیوی سے دب کر اور زیردست ہو کر رہے گا۔ یا عین ممکن ہے کہ بیوی کو پھر طلاق ہو جائے اور وہ دوسرے خاوند کی کمائی میں سے حصہ رسدی وصول کر کے تیسرا نکاح کر لے۔ یہ صورت حال مغربی ممالک میں عام ہے۔ آزادیٔ نسواں کے دلربا نام پر نکاح، طلاق بالکل کھیل بن کر رہ گئے ہیں۔ عائلی زندگی تشتّت و افتراق کی نذر ہو چکی ہے اور وہاں ایسے زن مُرید اور نکھٹو مرد بھی بہت پائے جاتے ہیں جو اس انتظار

میں رہتے ہیں کہ کوئی بیوی صاحبہ اپنے سابق طلاق زدہ خاوند کی کمائی کو ساتھ لائیں اور وہ اس پر داد عیش دیں۔ اگر بیوی کی ایسی دولت یا اندوختہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ بیوی کو کمانے کے لیے بازار یا دفتر میں بھیج دیتے ہیں، خود سیر سپاٹوں اور رنگ رلیوں میں مشغول رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری اہلیہ پی۔ ایچ۔ ڈی (PUTTING THE HUSBAND THROUGH) کا امتحان پاس کر رہی ہے۔ اگر بالفرض یہ صورت ہمارے ہاں سر دست نہ پیدا ہو تب بھی مطلقہ کو طلاق دینے والے کی جائداد میں سے حصہ دلانے کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہو گا کہ طلاق کے بعد نکاح ثانی نہ کرنے اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے رجحان کو تقویت پہنچے گی اور اس سے جو معاشرتی مفاسد و معایب رونما ہوں گے ان کا تصور کر لینا مشکل نہیں ہے۔

اگر ہمارے قومی قائدین پوری قوم کو اسی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمارے مسلمان بھائی بہنوں اور بہو بیٹیوں کو بھی آنکھیں کھول کر خوب اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے کہ یہ راستہ کدھر کو جا رہا ہے اور حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے گمراہ کن نعرے ہمیں بالآخر کہاں تک پہنچائیں گے۔ ہمارا کمزور قلم اور ہماری ناتواں آواز جس حد تک کام کر سکتی ہے، ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔

گر نہ مانو گے قولِ حالی کا   پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

رپورٹ کی اس دفعہ کے آغاز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ خاصی زیادہ صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ شوہر بغیر کسی مناسب اور معقول سبب کے طلاق دے دیتا ہے، مگر کمیٹی کے ارکان نے دوسرے پہلو کو سامنے نہیں رکھا کہ خاصی صورتیں ایسی بھی تو ممکن ہیں جن میں طلاق بالکل مناسب اور معقول بنا پر دی گئی ہو۔ مثال کے طور پر اگر عورت بے وفائی اور بداخلاقی کی مرتکب ہوتی ہو یا کسی غیر مرد کے ساتھ فرار کر گئی ہو اور اس پر خاوند اسے طلاق دے تو کیا عورت پھر بھی آپ کے نزدیک مرد کی جملہ املاک کے ½ کی حقدار ہو گی؟ اس پر آپ شاید یہ کہیں گے کہ معقول یا نامعقول وجوہ کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی اور صرف معقول صورتوں میں حصہ دلائے گی۔ اس کے ساتھ آپ ان وجوہ کی ایک فہرست بھی مرتب کریں گے جو آپ کے نزدیک معقول یا غیر معقول ہیں اور تجربات کے بعد اس فہرست میں آئے دن رد و بدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہے گا غرض آپ اس مسئلے کے جتنے حل تلاش کریں گے ان سے مزید مسائل و مشکلات کا دروازہ کھلتا چلا جائے گا۔

رپورٹ پر سردست بحث کو ملتوی کرتے ہوئے اب ہم ایک انتہائی دلخراش اور رُوح فرسا سانحہ کے بارے میں چند الفاظ لکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے ملک میں گذشتہ ماہ کے اواخر میں رونما ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس وسیع پیمانے پر ہمارے ہاں سیلاب آئے ہیں اور ہزاروں بستیوں کے مکان و مکین جس تباہی اور مصیبت سے دوچار ہوئے ہیں یہ بھی ایک عظیم ابتلا ہے۔ ہم اللہ سے دُعا گو ہیں کہ وہ اپنا فضل و کرم فرمائے۔ جماعت اسلامی کے لیے جس حد تک ممکن ہے وہ اس آزمائش سے بچے ہوئے مسلمان بھائیوں کے تعاون سے آفت زدہ لوگوں کی امداد کر رہی ہے۔ لیکن جس حادثہ کا ذکر یہاں مقصود ہے وہ ہماری نگاہ میں ان ساری بلاؤں پر فوقیت رکھتا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ طوفانِ بادو باراں جس کی لپیٹ میں ہم آگئے ہیں یہ بھی اُسی جرمِ عظیم کا ثمرہ ہو جس کا ارتکاب سرزمین پاکستان میں ہوا ہے اور جس کی صحیح معنوں میں کوئی تلافی اب تک نہیں ہو سکی۔ قارئین کے علم میں یہ المناک واقعہ آچکا ہے اور وہ اسے فراموش نہیں کر سکتے کہ جولائی میں حکومت سندھ کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی ضبطی کا شرمناک آرڈر جاری ہوا تھا۔ اس کے بعد وزیر اعلیٰ سندھ نے اس آرڈر کو منسوخ کرتے ہوئے ایک ڈپٹی سکرٹری اور ایک سیکشن افسر کو معطل کر کے فرمایا تھا کہ ان دونوں نے بڑی ذلیل حرکت کی ہے اور ان کے خلاف تحقیقات کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔

اس وقت ہم یہ سمجھتے تھے کہ منسوخی اور معطلی کے احکام کے بعد اب مزید ضروری کارروائی ہوگی، اُن بد بخت افراد کے نام منظرِ عام پر آئیں گے اور انہیں ایسی عبرت ناک سزا دی جائے گی جس سے ہمارے مجروح قلوب کی تشفی ہوگی اور آئندہ کسی خبیث کو ایسی بے حیائی کی جرأت نہ ہوگی لیکن اسے ملک اور اہلِ ملک کی بدنصیبی کے سوا اور کس چیز پر محمول کیا جائے کہ اب تک ان گھٹیا اور پاجی مجرموں کے متعلق کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ نام کے کلمہ گو ہیں، منافق ہیں، داہر کی ذریت ہیں، ہندو ہیں، قادیانی ہیں یا عیسائی و یہودی ہیں۔ یہ پاکستان جس کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بیان کیا جاتا تھا اور جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا کیا اس میں بھی کسی بد طینت کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ہمارے آقا و مولا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر قدغن لگانے کا تصور بھی اپنے دماغ کے تاریک گوشوں میں لا سکے؟ لیکن ہمارے ہاں یہ جانگداز المیہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ ہم اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اس پریس نوٹ کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جو اگرچہ واپس لیا جا چکا ہے مگر اس سے پیدا شدہ زخموں کا اندمال ابھی تک نہیں ہو سکا۔ نوٹیفکیشن یہ ہے:

"حکومت سندھ کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ ایک پمفلٹ بعنوان خطبہ حجۃ الوداع شائع کردہ شعبہ نشر و اشاعت

پاکستان جماعت حنفی اہل سنت ادارہ تعلیم الاسلام گولیمار بازار کراچی میں ایسے الفاظ کاشارے کنندہ اور واضح حوالے موجود ہیں جن سے پاکستان کے شہریوں کے مختلف فرقوں کے درمیان عداوت، بدظنی اور نفرت کے جذبات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس پمفلٹ کی نوعیت کے بارے میں شق (۱)، ذیل عنوان I اور دفعہ مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس ۱۹۶۳ء میں بیان کیا گیا ہے اور ہر گاہ کہ مذکورہ اردو پمفلٹ جس کا عنوان خطبہ حجۃ الوداع ہے اغدیں حالات مذکورہ آرڈیننس کی دفعہ ۲۹ کے تحت قابل ضبطی ہے۔ اب اس لیے ان اختیارات کی رو سے جو دفعہ ۲۹ مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس ۱۹۶۳ء کی رو سے حکومت سندھ کو حاصل ہیں، حکومت بکمال مسرت یہ اعلان کرتی ہے کہ مذکورہ بالا اردو پمفلٹ خطبہ حجۃ الوداع کی تمام کاپیاں حکومت سندھ کی طرف سے ضبط کی جاتی ہیں اور سندھ میں جہاں کہیں بھی یہ پمفلٹ دستیاب ہو اسے ہر پولیس افسر جس کا عہدہ سب انسپکٹر سے کم نہ ہو، ضبط کر سکتا ہے۔"

نقل کفر کفر نہ باشد، ہم نے تھرتھراتے قلم کے ساتھ یہ اقتباس درج کیا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس گزٹ کا اجراء کرنے والا خواہ کوئی افسر ہو یا سکرٹری ہو وہ اس قابل ہے کہ اسے چوراہے میں کھڑا کر کے اس کی کھوپڑی پر جوتوں کی بارش کی جائے اور دُرّوں سے اس کی چمڑی اُدھیڑی جائے۔ اُسے محض چپکے سے معطل یا برخاست کر دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ سندھ کے وزیر اعلیٰ جن کا نامِ نامی غلام مصطفیٰ ہے ان کا یہ دینی و منصبی فریضہ ہے کہ وہ ہمیں ان شاتمینِ رسول کے نام بتائیں جن کا جرم شردھانند سے بڑھ کر ہے اور ان کے خلاف علانیہ تعزیری کارروائی کریں۔ ہم وزیر اعظم پاکستان سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ اس سنگین سانحہ میں ذاتی دلچسپی لیں اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔ حرمت و ناموسِ رسالت کوئی صوبائی مسئلہ نہیں، بلکہ پورے پاکستان اور مسلمانوں کے دین و ایمان کا مسئلہ ہے۔ فارس کے کسریٰ خسرو پرویز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک چاک کرنے کی حرکت کی تھی تو اس کی سلطنت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجے میں پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ اب ہمارے ملک میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس الوداعی خطاب پہ بندش عائد کرنے کی جسارت کی گئی ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک چارٹر ہے اور جس کے متعلق آنحضورؐ نے خود فرمایا تھا کہ جو اس خطبے کو سننے کے لیے حاضر ہے، وہ اسے غیر حاضر اور غائب تک پہنچا دے۔ اگر اس جرم کے مجرموں کی سزا میں تاخیر و تخفیف ہو گی تو حاکم و محکوم سب عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔

مطبوعات جماعت اسلامی پاکستان

مصورِ پاکستان علامہ اقبال کے نظریات و افکار پر

مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک فکر انگیز تقریر

اقبال اور پاکستان

۴ روپے سینکڑہ

جماعت اسلامی کے

۲۹ سال

ایک مکمل تعارف — ایک تاریخی دستاویز

جس میں بانی جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

نے جماعت اسلامی کے قیام کی غرض و غایت اور ۲۹ سالہ

گذشتہ سفر کی مکمل روداد بیان کی ہے اور پاک و برصغیر

کی تاریخ کے اہم گوشوں سے نقاب اٹھایا ہے۔

قیمت ۱۰۰ روپے سینکڑہ

مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تازہ تالیف

عالمی اسلامی کانفرنس لندن میں پڑھا جانے والا مقالہ

یہودیت ۔ عیسائیت

اسلام کس چیز کا علمبردار ہے؟

What Islam Stands For?

آسان تر جمہ

اسکولوں کے طلبہ، کم تعلیم یافتہ لوگوں اور دیہاتی آبادی کے لئے

پیش خدمت

جناب عبدالغنی گیلانی

کا تحریر کردہ

جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے قلم سے

تعارف جماعت اسلامی پاکستان

جماعت اسلامی پاکستان

منصورہ ملتان روڈ لاہور